سلمان عبدالصمد

معاصر فکشن میں غضنفر کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ ان کے ناول اور افسانے نہ صرف فکشن کے سرمائے میں اہم اضافہ ہیں بلکہ قاری کی حسیت کو عصری تناظر میں بیدار کرنے اور اس کے اندر خود احتسابی کے عمل کو مہمیز کرنے کے لحاظ سے بھی مؤثر اور قابل قدر ہیں۔ نیرنگی تنوع ان کا وصف خاص ہے اور ان کے وسیع تر تخلیقی تجربے کا غماز بھی۔ غضنفر اپنے تجربے اور مشاہدے کو فکشن کے پیکر میں ڈھالنے کا ہنر بخوبی جانتے ہیں۔ افسانہ تراشی میں وہ بلا کی مہارت رکھتے ہیں۔ ان کے یہاں بیانیہ واقعات کی کھتونی محض نہ بن کر قاری کے احساس و شعور کی تہوں میں اضطرابی ترنگیں پیدا کرنے کا کام کرتا ہے اور یہ صفت انھیں اپنے ہمعصروں میں ممتاز بناتی ہے۔

سلمان عبدالصمد نے غضنفر کے فکشن کا نہ صرف پوری دلچسپی اور توجہ سے مطالعہ کیا ہے بلکہ بحیثیت ایک سنجیدہ قاری غضنفر کے فکر وفن کو پرکھنے کی کاوش بھی کی ہے۔ انھوں نے غضنفر کے ناولوں اور افسانوں کے تجزیے میں اپنی تنقیدی فہم کو بروئے کار لانے کی خوب خوب سعی کی ہے۔ کہانی پن بیانیہ کی پہلی ضرورت اور پہچان ہوتا ہے۔ اس سے فکشن میں Readability کی خصوصیت نمایاں ہوتی ہے۔ غضنفر کے فکشن میں یہ خصوصیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ اسے غضنفر کی فکشن نگاری کی کامیابی ہی کہیں گے کہ اس نے نہ صرف سلمان عبدالصمد جیسے جواں سال قاری کو اپنی طرف متوجہ کیا ہے بلکہ انہیں فکشن کی تفہیم وتجزیے کا ذوق وشوق بھی عطا کیا ہے۔ میری دعا ہے کہ خدا اس ذوق وشوق کو دوبالا کرے۔ (آمین)

پروفیسر انور پاشا
جواہر لعل نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی

غضنفر کا فکشن

سلمان عبدالصمد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی ۶

GHAZANFAR KA FICTION

by

Salman Abdussamad

Year of Ist Edition 2014
ISBN 978-81-8223-379-0
Price Rs. 160/-

نام کتاب	:	غضنفر کا فکشن
مصنف	:	سلمان عبدالصمد
سن اشاعت	:	۲۰۱۴ء
صفحات	:	۱۲۸
قیمت	:	۱۶۰ روپے
تعداد	:	۵۰۰
زیر اہتمام	:	دائمی پرواز ایجوکیشنل اینڈ سوسائٹی، لکھنؤ
مطبع	:	عفیف پرنٹرس، دہلی ۶

Published by

EDUCATIONAL PUBLISHING HOUSE

3108,Vakil Street, Kucha Pandit, Lal Kuan, Delhi-6(INDIA)
Ph : 23216162, 23214465, Fax : 0091-11-23211540
E-mail: info@ephbooks.com,ephdelhi@yahoo.com
website: www.ephbooks.com

انتساب

والد ماجد ابوالکلام

اور

والدہ محترمہ شہناز بانو

کے نام

سوانحی کوائف

نام	:	عبدالصمد
قلمی نام	:	سلمان عبدالصمد
ولادت	:	12 دسمبر 1988
جائے پیدائش	:	دربھنگہ (بہار)
تعلیم	:	بی. اے 2011، لکھنو یونیورسٹی، لکھنو (یوپی)
		ایم. اے 2014 دہلی یونیورسٹی، دہلی
مشغولیت	:	صحافت، افسانہ نگاری، تنقید
		چنداچھے افسانے، لاپتہ نوجوان، بلی کا بکرا،
		چوتھا ستون اور خودغرض مسیحا
تصانیف	:	دلکش و دلنشیں مکالمے، 2010
		قرآن کا نظریۂ سیاست، 2012
مستقل پتا	:	گجبور، پوسٹ برّا، تھانہ کوشیشوراستھان،
		ضلع دربھنگہ (بہار)
موجودہ پتا	:	N106، فرسٹ فلور، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر نئی دہلی 25
موبائیل	:	9891233492
ای میل	:	salmansamadsalman@gmail.com
		wahidnazeerjmi@gmail.com

مشمولات

☆☆

یہ کتاب کیسی ہے؟

ڈاکٹر واحد نظیر

اکادمی برائے فروغِ استعدادِ اردو میڈیم اساتذہ

جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

سلمان عبدالصمد ایم۔اے اردو کے طالب علم ہیں اور ساتھ ہی ساتھ صحافت پیشہ بھی، اللہ کا کرم ہے کہ ابھی ان کا قلم آشوبِ خرد کی آلائشوں سے محفوظ ہے۔ یوں تو مذہبی نوعیت کی تحریریں بلکہ کتابیں بھی اہل نظر سے استنادِ قرأت حاصل کر چکی ہیں لیکن یہ کتاب ''غضنفر کا فکشن'' ادب کے دشت کی سیاحی کا پہلا قدم ہے۔ یہ ایک نو وارد کی ادبی دشت نوردی ضرور ہے مگر ان کے علمی زادِ سفر اور رہ روی کے سلیقے سے یہ امید بندھتی ہے کہ ان کے حق میں اس راستے کے خارزار، سدِّ راہ نہیں مسافر نواز ثابت ہوں گے۔

غضنفر کے جن ناولوں، خاکے اور افسانے کے مجموعوں کو سلمان عبدالصمد نے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، ان میں زیادہ تر کتابیں ادبی حلقے میں زیر بحث رہ چکی ہیں۔تبصرے، تنقیدی تجزیے، استفساراتی مضامین گویا ہر کتاب معتبر لکھنے والوں

کی تعبیر و تفہیم سے گزر چکی ہے۔ ایسے میں اس کتاب کا جواز صرف اتنا ہے کہ سلمان عبدالصمد نے اپنی تنقید کی اساس اور بجنل متن پر رکھی ہے، علمی انحطاط کے اس دور میں جب کسی موضوع پر دو چار مضامین پڑھ کر الگ مضمون بنا لینے کا رویہ ناقدانہ شعار بن چکا ہو، اپنی گفتگو کا محور خالص متن کو قرار دینا جہاں مروجہ سہل پسندی کی شکست کا اعلان ہے، وہیں لکھنے والے کی بنیادی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے مضامین نو کے انبار لگائے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دوسروں کے خرمنِ تنقید سے خوشہ چینی بھی نہیں کی ہے۔

متن میں معنی کے نئے امکانات ہمیشہ روشن رہتے ہیں اور زندہ متن کی تو خوبی ہی یہی ہے کہ وہ ہر عہد سے اپنا انسلاک قائم رکھتا ہے۔ اس میں اتنے پہلو ہوتے ہیں کہ زمانے کے ساتھ ساتھ اس کی تعبیریں بھی کروٹ لیتی رہتی ہیں۔ شعوری یا غیر شعوری طور پر سلمان عبدالصمد نے اپنے مطالعے کے لیے غضنفر جیسے فن کار کی تخلیقی تحریروں کا انتخاب کیا، جنھیں لفظوں سے چراغ اور پھول کا کام لینے کا ہنر خوب آتا ہے۔ ظاہر ہے جب تک آنکھیں پیدا ہوتی رہیں گی اور مسام بیدار رہیں گے روشنی کی اہمیت اور خوشبو کی لطافت کے معترف بھی نظر آتے رہیں گے۔

مصنف نے ''باتیں دل کی'' کے عنوان سے شروع ہی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ افسانوی ادب کے مطالعے میں ناولوں کی ضخامت مانع رہی لیکن غضنفر کے ''مانجھی'' نے یہ دریا عبور کرنے پر مجبور کر دیا اور وہ بھی اس خوبی کے ساتھ کہ نہ ہانپنے کی نوبت آئی اور نا ہی ستانے کی۔ یہ دراصل کسی تحریر کی Readablity کا اعتراف ہے۔ مصنف نے یہ بھی اعتراف کیا ہے کہ یہ تحریریں غضنفر پر اب تک لکھی گئی تحریروں کے مطالعے کے بغیر سپردِ قلم کی گئی ہیں اور ان میں ''قطعی کسی کی رائے کی آمیزش نہیں''۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس مختصر سے فقرے میں ایک بڑے دعوے کی گونج شامل ہے لیکن مجھے امید

ہے کہ ان تحریروں کو پڑھ کر اس نوجوان لکھنے والے کا حوصلہ آپ سے ضرور داد حاصل کرے گا، کیوں کہ ایسے دعووں کے تقاضے سہل نہیں ہوتے، یہ تب ہی دلیل آشنا ہوتے ہیں جب راقم کو ڈیڑھ دو سو صفحات پڑھ کر ڈیڑھ دو صفحے لکھ کر بھی قانع نہیں رہنے کی دولت میسر ہو۔

غضنفر کی کتابوں کے نام سے استفادہ کرتے ہوئے مصنف نے جس خوش اسلوبی سے اپنی تحریروں کے عناوین قائم کیے ہیں، اس سے ان کی انتقادی بصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔ شوراب کی ٹپکتی بوندیں، مانجھی کی پتوار، ہندوستانی سماج میں تحلیل وش کا منتھن،، تانے بانے کینچلی کے، کہانیوں کا سمندر کہانی انکل، دویہ بانی کا زہر، پانی کی خشکی، فسوں کا فسانہ، مم کا استعارہ، حیرت فروش کی کہانیاں اور سرخ رو کا سفید رنگ جیسے عناوین سے وہی لطف اندوز ہوسکتے ہیں، جنھوں نے غضنفر کی کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ ان عنوانات میں محض لفظی مناسبات کا حسن ہی نہیں ہے بلکہ عبارت کو اشارے اور تفصیل کو اجمال میں پیش کرنے کا شعور بھی پنہاں ہے۔ کلید متن کی خوبی سے آراستہ لفظ کے انتخاب کا سلیقہ وہ نعمت ہے جس سے بڑے بڑے بھی محروم ہی مرحوم ہو جاتے ہیں۔ دیگ کا اندازہ لگانے کے لیے ایک ہی چاول کافی ہے صرف یہ جاننا ضروری نہیں ہوتا، بلکہ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ کور سے چپکا ہوا چاول پوری دیگ کی نمائندگی نہیں کرسکتا۔

متن کے بطن میں پوشیدہ معانی سے ہم کلامی کی مختلف سطحیں ہوتی ہیں، عام قاری کی سطح الگ ہوتی ہے اور صاحبِ نظر ناقد کی الگ۔ دورانِ قرأت معنی کی جس سطح سے ہم مخاطب ہوتے ہیں، فکر و احساس میں اسی کے لحاظ سے تبدیلی آتی ہے۔ عام قاری تبدیلی کی شدت کے مطابق انبساط حاصل کرتا ہے اور بس۔ ناقد اس انبساط کو لفظی پیکر عطا کرتا ہے تاکہ دوسروں کی بصیرت کا سامان مہیا ہوسکے۔ گویا ناقد اس کیفیت

کے تعاقب میں ہوتا ہے جس کی گرفت میں آکر تخلیق کار نے متن کو وجود پذیر کیا۔ سلمان عبدالصمد کی تحریریں پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ دورانِ قرأت متن میں پنہاں تخلیق کار کی اس کیفیت کے ارد گرد طواف کرنے میں کامیاب ہیں۔

سلمان عبدالصمد کے مضامین پڑھ کر پہلی رائے یہی قائم ہوتی ہے کہ یہ اپنی گفتگو کے لیے ایسی تمہید سے گریز کرتے ہیں جو انھیں ''آمدم برسرِ مطلب'' جیسے اعتذار یہ فقرے کہنے پر مجبور کرے۔ تقریباً تمام مضامین میں براہ راست رائے زنی کا رویہ روا رکھا ہے۔ شوراب کی ٹپکتی بوندیں کا آغاز اس طرح ہوتا ہے:

''ناول نگار نے خطوط کے تبادلے میں ____ سماجی ناہمواریوں کی آڑی ترچھی بے شمار لکیریں کھینچ دی ہیں، شوراب انھی لکیروں کا مرقع ہے''۔

اسی طرح ناول 'مانجھی' پر اظہار خیال کرتے ہوئے مضمون ''مانجھی کی پتوار'' کی شروعات یوں ہوتی ہے:

''صاحبِ کتاب نے کوزے میں سمندر نہیں ____ سنگم میں دنیا کو سمو دیا ہے''۔

مضمون 'ہندوستانی سماج میں تحلیل وش کا منتھن' کا پہلا جملہ یہ ہے:

'وش منتھن' کے مطالعے سے عمل کا ردِ عمل اور 'کھسیانی بلی کھمبا نوچے' والی مثل کی عملی تفسیر سامنے آجاتی ہے۔'

کم و بیش جملہ مضامین کی ابتدا اسی طرح ہوتی ہے۔ گویا قاری کی توجہ مبذول کرنے کے لیے پہلے وہ پر کشش عنوان کو حربہ بناتے ہیں پھر مضمون کا آغاز ہی ایسے برجستہ اور مطمحِ نظر کو واضح کرنے والے جملوں سے کرتے ہیں کہ قاری کے مطالعے کی آمادگی اور بھی پختہ ہو جاتی ہے۔ حالاں کہ اس طریقۂ کار میں یہ خدشہ ہمیشہ بنا رہتا ہے کہ تحریر سے قاری کی توقعات بہت زیادہ ہو جاتی ہیں اور اگر ابتدائی حصے کا معیار تا آخر قائم نہیں رہ پاتا تو مطالعے کے بعد انبساط کے مقابلے مایوسی کی کیفیت زیادہ گہری

ہو جاتی ہے۔ یوں بھی کسی تحریر میں ایک خاص معیار کا توازن بنائے رکھنا پختہ قلم کے لیے بھی شرف یابی کی بات ہوتی ہے۔اس کتاب کی تحریروں میں کہیں کہیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ایک صاف شفاف آئینہ رفتہ رفتہ دم کشیدہ ہوتا جارہا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ مصنف کی نوعمری کے سبب ایسا ہونا زہر کا تریاق بننے کے مصداق ہے۔ کسی شے کے حقیقی ہونے کی پہچان یہ بھی ہے کہ اس کی خوبیاں اس سے مطابقت رکھتی ہوں۔ بچہ مربیانہ جملے بولے تو اس کی بات مشکوک ہو جاتی ہے اور سننے والے پر یہ گمان گزرنے لگتا ہے کہ 'زباں منصور کی ہے بولنے والا ہے پردے میں'۔

سلمان عبدالصمد کا وصفِ دیگر متن سے جوجھنے کی خو ہے۔ یہی سبب ہے کہ غضنفر کے فکشن میں پوشیدہ فنی نکات تک پہنچنے میں بیشتر دفعہ کامیاب ہوئے ہیں۔ اللہ کرے یہ ادب فہمی کا ذوق اور فہم نویسی کی مشق مسلسل جاری رہے اور ستاروں جیسے جملوں کے درمیان اچانک مہتابی جملے کے نمودار ہونے سے پیدا ہونے والی اسلوب کی ناہمواری 'رفتہ رفتہ ایک دن ہم بھی شمس وقمر ہو جائیں گے' کا پیش خیمہ ثابت ہو۔

باتیں دل کی

جانے کیوں شروع سے ہی افسانہ لکھنے کا شوق رہا، لیکن افسانوی ادب میں دلچسپی نہیں رہی، بالخصوص ناول پڑھنے کی طرف طبیعت کبھی مائل نہیں ہوئی، یہاں تک کہ طول طویل ناول دیکھ کر ہی خوف طاری ہو جاتا تھا، اب بھی ڈر سا لگتا ہے، البتہ کئی دفعہ ناول پڑھنے کی شروعات بھی کی، مگر چند صفحات کے بعد ناولوں سے خود کو الگ کر لیا، ہاں اتنا ضرور ہے کہ آٹھ دس افسانے لکھے، ظاہر ہے کہ افسانوی ادب سے نظریں چرا کر تخلیق کیا گیا افسانہ کیسا ہو سکتا ہے۔

پیش نظر کتاب ''غضنفر کا فکشن'' میری پہلی ادبی کاوش ہے، وہ بھی ناولوں پر علاحدہ علاحدہ مضامین۔ ناولوں سے دوری اور پھر ناولوں پر کام، شاید قارئین کو معمہ سا لگے، چنانچہ اس ادبی میلان کی تحریک پر روشنی ڈالنا مناسب معلوم ہوتا ہے، ایک رات غضنفر کا مشہور ناول ''مانجھی'' ہاتھ لگا، حسب معمول پڑھنا شروع کیا تو پڑھتا ہی چلا گیا اور صبح کوئی پانچ چھ بجے تک اسے مکمل بھی کر لیا، یہ پہلا ناول تھا، جسے میں نے مکمل پڑھا، وہ بھی

ایک نشست میں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ قلم برداشتہ وہ تاثرات بھی سپرد قلم وقرطاس کردئے، جو ناول پڑھنے کے بعد میرے ذہن ودل پر مرتب ہوئے، اس کے بعد غضنفر کے فکشن سے مجھے دلچسپی سی ہوگئی۔ ناولوں کی تلاش جاری رہی، جدوجہد کر کے ان کے تمام ناول حاصل کیئے، باضابطہ ان تمام ناولوں کو پڑھا اور ان پر فی الفور لکھا بھی، غضنفر کے ناولوں پر جو کچھ لکھا وہ میری اپنی رائے ہے، یوں تو ان کے ناولوں کی تعریف وتوصیف میں بہت لکھا گیا اور اعتراضات بھی ہوئے، مگر میں نے براہ راست ان کے تمام ناولوں کا مطالعہ کیا اور جو رائے بنی، اسے سپرد قلم کردیا، اس میں قطعی کسی کی رائے کی آمیزش نہیں۔

نو ناولوں، ایک افسانوی مجموعہ ''حیرت فروش'' اور خاکوں کا مجموعہ ''سرخ رو'' پر لکھنے کے بعد کوئی 140 صفحات ہوگئے تو دوستوں نے کہا کہ اسے کتابی شکل دینا بہتر ہوگا، چنانچہ نوک پلک درست کرنے پر حتی الوسع دھیان دیا۔ یہاں یہ وضاحت بھی شاید مناسب ہے کہ میں نے غضنفر کی افسانوی تحریروں میں ان کے خاکوں کو بھی شامل کیا ہے، ایسا کیوں؟ وجہ یہی ہے کہ ان کے خاکوں میں بھی اسی طرح افسانوی عناصر بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں، جس طرح منٹو کے خاکوں میں۔ ''سرخ رو'' میں کئی ایک ایسے خاکے بھی ہیں، جن میں افسانوی فضا اس قدر غالب کہ اگر اخیر کی چند سطور نکال دی جائیں تو انہیں افسانے کے زمرے میں شامل کیا جاسکتا ہے۔

اس فرحت وانبساط کے موقع پر میرے شکریہ کے خصوصی مستحق ہیں جناب ڈاکٹر واحد نظیر صاحب، جنہوں نے شکوۂ تنگدامانی کے زمانہ میں بھی میرے مسودے پر گہری نظر ڈالی اور مشفق استاد پروفیسر ابن کنول اور پروفیسر انور پاشا صاحب کا بھی، کیوں کہ انہوں نے میری ہمت افزائی کے لئے چند سطور تحریر کیں، اسی طرح ہم عمر اور ہم درس فیاض احمد، شاداب عالم، عادل عفان، شاہ نواز قمر، محمد مسرور فیضی، فیض الاسلام فیضی،

افضل حسین خان، محمد ظہیر الحق اور فیصل ذہین کی ہمت افزائی اور معاونت کو فراموش کرنا بڑی ناسپاسی ہوگی۔

یوں تو میں صحافتی مضامین گذشتہ کئی برسوں سے لکھتا چلا آیا ہوں، اب بھی کسی نہ کسی طرح صحافت سے وابستگی ہے۔ ایم اے کے طالب علم (وہ بھی صحافت سے مرعوب) کے لئے فکشن کی جولان گاہ میں خود کو کامیاب بنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے، بس میری کامیابی اس میں ہے کہ میں آپ کی دعاؤں کا حق دار ہو جاؤں۔

سلمان عبد الصمد

19/مارچ 2014

شوراب کی ٹپکتی بوندیں

ناول نگار نے خطوط کے تبادلے میں ____ سماجی ناہمواریوں کی آڑی ترچھی بے شمار لکیریں / خطوط کھینچ دی ہیں۔ ''شوراب'' انہیں لکیروں کا مرقع ہے۔

''شوراب'' بھی غضنفر کے دیگر کامیاب ناولوں میں سے ایک ہے۔ جس میں سماج مختلف زاویوں سے انگڑائی لیتا ہے۔ تعلیمی اداروں کی چولیں ہلتی نظر آتی ہیں۔ صلاحیت ولیاقت کے پہاڑوں میں بدعنوانی کی دیمک نظر آتی ہے۔ شوہر وبیوی کی غیر آہنگی سے بے راہ روی کے متعدد دروازے کھلتے ہیں۔ بچوں کی پرورش کو لے کر ماں کی مچلتی تمنائیں خاک میں مل جاتی ہیں۔ دولت وشہرت کا نشہ ہر قیمت چکانے پر آمادہ نظر آتا ہے، تعلیمی نظام اور طریقہ تعلیم کی گھناؤنی صورتیں بھی دکھائی دیتی ہیں۔

شوراب کی کہانی کچھ یوں ہے کہ شاداب نامی ایک لڑکا (ریسرچ اسکالر) ہندوستان میں اپنے خواب پورا ہوتا نہ دیکھ کر بادل نخواستہ سعودی کے لئے رخت سفر باندھتا ہے، اس امید کے ساتھ کہ وہاں جا کر گھریلو مسائل کے حل کا موقع ملے گا، ضروریات زندگی پوری ہوں گی، ہر کام آسانی سے ہو جائے گا۔ اس کے وہاں چلے

جانے کے بعد بھی محلے کی کسی بھابھی سے چھپ چھپا کر خط وکتابت کا سلسلہ جاری رہتا ہے، ان کے خطوط کے تبادلہ میں سماج کی آڑی ترچھی لکیریں ابھرتی ہیں، سعودی اور ہندوستان کی بے شمار چھوٹی بڑی باتیں اس طرح سامنے آنے لگی ہیں، جیسے یہ کوئی ناول نہیں بلکہ حالات پر ایک بیباکانہ تبصرہ ہے یا چشم کشاں تجزیہ۔

اس ناول کا دردناک سماجی پہلو یہ بھی ہے کہ دھن دولت کی چکی میں لڑکیاں اس طرح پیس دی جاتی ہیں کہ ان کی زندگیاں اجیرن ہوجاتی ہیں۔ ان کے تمام خواب وارمان مٹی میں مل جاتے ہیں۔ سسرال میں ان کا پل پل کاٹنا مشکل ہوجاتا ہے، اس ناول میں بابوجان کی شادی شیبا سے کردی جاتی ہے، بابوجان مطلق جاہل اور شیبا تعلیم یافتہ، شیبا کی زبان صاف ستھری اور نکھری، طبیعت تعلیم کی طرف مائل، مگر بابوجان تعلیم بیزار بلکہ تعلیم دشمن، زبان تلخ وترش اور غیر مہذب، شہر اور دیہات کا فرق بھی، اس پر مستزاد یہ کہ بابو کے گھر اور علاقہ کا دم گھونٹ دینے والا ماحول۔ ان ناہمواریوں کے باوجود دونوں کی شادی آخر کیسے کردی جاتی ہے؟ کیا ان تفاوت کے باوجود دونوں ہنسی خوشی زندگی گزار سکتے ہیں؟ ذرا بھی سمجھ رکھنے والا یہی کہے گا کہ دونوں شیر وشکر ہوکر نہیں رہ سکتے ہیں، اس ناول میں ایسا ہی ہوتا ہے کہ شیبا کی زندگی تلخیوں، ناہمواریوں اور بے شمار پریشانیوں سے بھر جاتی ہے، شیبا اپنے اس دردناک راز کو سوائے شاداب کسی کے پاس کھولنے سے گریز کرتی ہے، ایک خط میں وہ اپنی روتی، بلکتی اور کراہتی داستان الم شاداب کو لکھ بھیجتی ہے، جو کہ صرف شیبہ کا ہی درد نہیں، اسی کی داستان الم نہیں بلکہ معاشرہ کی بے شمار لڑکیوں کا کرب ہے۔ یہ خط پہلے سوال کھڑا کرتا ہے کہ ایسی شادی کے لئے بابوجان کا گھرانہ ذمہ دار ہے کہ شیبہ کے والدین یا پھر کوئی اور......؟"

میں اپنی اس حالت کا قصوروار اپنے شوہر کو نہیں ٹھہراتی اور نہ ہی اس کے گھر والوں کو اس کا ذمے دار مانتی ہوں، وہ لوگ تو بے چارے معصوم ہیں، وہ تو

وہی سب کچھ جائیں گے نا جوان کے ماحول اور بیک گراونڈ نے انہیں سکھایا ہے
........آپ سوچ رہے ہوں گے کہ ذمے دار یہ نہیں تو پھر کون؟......ذمے دار
میرے اپنے ہیں ، شاداب بابو! وہ اگر تھوڑا صبر سے کام لیتے اور کچھ کوشش
کرتے تو مجھے اس سے بہتر ماحول مل سکتا تھا۔ یہ ممکن ہے کہ کوئی ایسا گھر مل جاتا
جس کی میں نے تمنا کی تھی ، مگر گھر والوں کو بیٹی کے معاملے میں صبر کہاں ہوتا
ہے؟ وہ تو اسے بوجھ سمجھتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ جلد سے جلد وہ اس بوجھ کو اپنے
سر سے اتار پھینکیں ، ٹھہریئے! شاید گھر والے ذمہ دار نہیں ، جتنا کہ ہمارا سسٹم
ہے ، وہ تو اس سسٹم کی گاڑی میں جتے جانور ہیں جنہیں سسٹم چابک کی چوٹ
پر دوڑنا ہی ہے ، سسٹم نے اس کے ذہنوں میں یہ تصور بٹھا رکھا ہے کہ لڑکی کو کسی
بھی صورت میں گھر سے باہر کرنا ہے''۔(شوراب: صفحہ 49)

آپ کو بھی احساس ہو گیا ہو گا کہ اس خط میں شیبا نے کس چابکدستی اور باریکی سے معاشرہ کو پیغام دینے کی کوشش ہے اور ایسی شادیوں کا ذمہ دار پہلے والدین کو اور پھر کس خوش اسلوبی سے معاشرہ کو ٹھہرایا ہے۔

اس خط کا ایک اور پہلو بھی توجہ طلب ہے ، یوں تو شیبا کی سسرال میں عیش وعشرت کا سارا سامان موجود ہے ، مگر اس کی زندگی اداس ہے ، کھانے پینے کی لذیذ اور انواع واقسام کی چیزیں موجود ہیں ، مگر جسم بھوکا پیاسا ہے ، رہنے کے لئے بلند وبالا عمارت ہے ، مگر شیبا کی زندگی تپ رہی ہے ، کیونکہ اس کا شوہر اس سے برسوں نہیں ملتا ہے ، وہ بیرون ملک رہتا ہے۔ خط کچھ اس طرح حقیقت بیان کرتا ہے:

''میں نے ہمت تو کر لی ہے مگر سمجھ میں نہیں آتا کہ کہاں سے شروع کروں
؟ کون سا باب کھولوں؟ کون سا زخم دکھاؤں ، کس درد کا حال بتاؤں؟ کس الم کی
آواز سناؤں؟ شاداب بابو! بظاہر میں ایک خوشحال گھر کی کامیاب بہو ہوں ،
میرے میکے اور دنیا والوں کو لگتا ہے ، شاید آپ کو بھی لگتا ہو کہ میں بہت خوش

نصیب ہوں ، بہت سکھی ہوں ، عیش وآرام کی زندگی گزار رہی ہوں ، شاندار
مکان میں رہ رہی ہوں ، بے شک میں جس مکان میں رہتی ہوں وہ ایک آرام
دہ مکان ہے ، اس کی دیواریں اونچی اور پختہ ہیں ، دیواروں میں لمبی چوڑی
کھڑکیاں ہیں ، بڑے بڑے روشن دان ہیں ، ہوا کی آمدورفت کا معقول انتظام
ہے ، پھر بھی میرا دم گھٹتا ہے ، میرا وجود کسی شکنجے میں کسا ہوا محسوس ہوتا ہے ،
بلاشبہ میں اچھا کھا رہی ہوں ، اچھا پی رہی ہوں ، گھر میں آرام وآسائش کی
ساری چیزیں موجود ہیں ، مگر میں بے آرام رہتی ہوں ، کھانے پینے کی عمدہ سے
عمدہ چیزیں آتی ہیں ، گھی ، دودھ ، مکھن ، ملائی ، گوشت ، مچھلی ، پھل فروٹ ، میوہ
جات ، مشروب کی چیزوں کی کمی نہیں پھر بھی بھوکی ہوں ، پیاسی ہوں ، میرا جسم ،
میری روح ، میرے حواس سبھی پیاسے ہیں ، شدید تشنگی سے دوچار ہیں ، یہ بھوک
، یہ پیاس ، یہ تشنگی صرف میرے مقدر میں ہی نہیں آئی ہے بلکہ میری جیسی اور بھی
بے شمار لڑکیاں اس آسیب کی شکار ہیں ، اس کی قید میں گرفتار ہیں اور ہمیں اس
صحرا میں ڈالنے والا کوئی اور نہیں بلکہ ہمارے اپنے ہیں ، بغیر سوچے سمجھے
ہمارے اپنے گھر سے نکال کر ہمیں کسی بھی گھر میں ڈال دیتے ہیں ، کہیں بھی
دھکیل دیتے ہیں اور اس احساس سے خوش ہو جاتے ہیں کہ انہوں نے اپنا فرض
پورا کر دیا ، وہ سمجھتے ہیں کہ لڑکی کے جسم میں صرف پیٹ ہوتا ہے یا زیادہ سے
زیادہ ایک اور انگ اور وہ ان دونوں کی بھوک کا سامان بہم پہنچانا ہی کافی سمجھتے
ہیں ، وہ یہ نہیں جانتے یا شاید بھول جاتے ہیں کہ لڑکی یا لڑکے کے پاس پیٹ اور
دوسرے انگ کے علاوہ بھی کچھ اعضا ہوتے ہیں ، اس کے بدن میں دل ، دماغ
، آنکھ ، کان ، ناک ، زبان وغیرہ بھی ہیں جن کے کچھ تقاضے ہیں ، جن کی
ضرورتیں ہیں ، بھوک ہے ، پیاس ہے ، ان کی بھوک پیاس کو مٹانا بھی اتنا ہی
ضروری ہے جتنا کہ پیٹ اور دوسرے انگوں کی ...... اپنے گھر میں ہوتی تو کیا
ہوتا ؟ صرف میری ایک ضرورت پوری نہیں ہو پاتی ، وہ ضرورت تو یہاں بھی
پوری طرح پوری نہیں ہو پاتی ہے ، مہینوں اور کبھی برسوں میں پوری ہوتی ہے ، مگر

وہاں میری باقی ضرورتیں تو پوری ہو ہی جاتیں ، ہاں پیٹ کی ضرورت کو پورا کرنے میں میرے ماں باپ کو تھوڑی پریشانی ضرور ہوتی"۔ (شوراب: صفحہ 43,44 اور 49)

اس سے صاف ظاہر ہوگیا کہ ملک سے بیرون ممالک جانے والے یہ سوچ کر جاتے ہیں کہ مسائل حل ہوں گے، مگر گھر پر بے شمار مسائل ان کے جانے کی وجہ سے جنم لے لیتے ہیں، شیبا تو سمجھدار اور باہمت تھی ، برداشت کا مادہ تھا اس میں، اس لئے وہ بے راہ رو نہیں ہوئی ، ورنہ تو معاشرہ کی بے شمار عورتیں شوہر کی غیر موجودگی میں بے راہ رو ہو جاتی ہیں، غیر مردوں سے ان کی نزدیکیاں بڑھنے لگتی ہیں۔

شیبا کے اس خط کے جواب میں شاداب نے بھی جو بات کہی ، وہ بھی واقعی ان عورتوں کے لئے نصیحت آمیز ہے، جو سسرال میں ناہمواریوں سے گزر رہی ہیں۔ جب شیبا شاداب کی باتوں پر عمل کر کے قلم تھام لیتی ہے تو بے شمار ایسے مسائل خطوط میں آجاتے ہیں، جو واقعی معاشرہ کے چہرہ پر زناٹے دار طمانچہ سے کم نہیں، شیبا سعودی گئے اپنے یہاں کے لوگوں کی جو داستان بیان کرتی ہے، اس میں درد ہے، شیبا یہ دکھاتی ہے کہ ایک لڑکا ہندوستان میں رہتا ہے تو کھانے کو بھی لالے، مگر جب وہی باہر ملک جا کر کماتا ہے تو مسائل ختم ہونے لگتے ہیں، خوشیاں دکھوں کو نگلنے لگتی ہیں، مگر سب سے بڑا مسئلہ یہ سامنے آتا ہے کہ روپیوں کے زعم میں لڑکے کس طرح والدین کی نافرمانی کرنے لگتے ہیں، کیسے وہ پیسوں کے بل پر معاشرہ کی لڑکیوں میں سما جانا چاہتے ہیں، کیسے وہ بے راہ ہو کر وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں، جس کی اجازت اسلام دیتا ہے اور نہ ہی معاشرہ ، دونوں کے تبادلۂ خطوط میں سعودی کے شیخ و کفیل کے کالے کارنامے بھی موجود ہیں، جو وہ موقع کا فائدہ اٹھا کر انجام دیتے ہیں۔

روپیوں کی رو میں خود شیبا کا شوہر بھی بہہ گیا تھا، کہتے ہیں نا کہ جب اس کی محبت حد

سے زیادہ بڑھ جاتی ہے تو انسان اندھا ہو جاتا ہے، تعلیم کی ناقدری ہونے لگتی ہے، کتابوں کی بے حرمتی ہوتی ہے، احسان فراموشی ہونے لگتی ہے، محسنوں کے ساتھ بھی ٹھٹھا کرنے اور انہیں نیچا دکھانے میں عار محسوس نہیں ہوتا، یہ تمام باتیں اس کے شوہر کے اندر بھی بدرجہ اتم پائی جانے لگی تھیں۔ شاداب ایک دفعہ بابو جان کو علی گڑھ اس غرض سے لے گیا تھا کہ وہ وہاں کام دھندا کر کے کچھ پیسے کما لے، اس ہمدردی کا صلہ بابو جان شاداب کو بے عزتی کی شکل میں دیتا ہے، ہر جگہ تحقیر آمیز اسلوب میں اس کا تعارف کراتا ہے۔

روپیوں کے دم اور باہر کے لوگوں سے تعلقات کی دہائی دے کر بابو جان نے مکھیا کا الیکشن تو جیت لیا، مگر وہ ہوس کی بیماری سے آزاد نہیں ہو پا رہا تھا، ایم ایل اے کی امیدواری کا بھوت سوار ہو گیا تھا، اس لیے وہ شیبا جیسی شریف عورت کو بھی داؤ پر لگانے میں شرم محسوس نہیں کر رہا تھا، بابو جان کے دوستوں نے اسے مشورہ دیا کہ اگر تمہیں ایم ایل اے کا ٹکٹ حاصل کرنا ہو تو شیبا کو ادھیکش سے ملواؤ، کیونکہ وہ عورتوں کا بڑا احترام کرتے ہیں، چنانچہ وہ شیبا کو ایک دفعہ ادھیکش جی سے ملانے لے گیا، ادھیکش کو احساس ہو گیا کہ شیبا جیسی قابل عورت بابو جان کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی نہیں گزار رہی ہو گی، اس لئے انہوں نے بابو جان سے بات کر کے شیبا کو ہفتہ میں دو دن خود پڑھانے کے لئے مقرر کیا، مشرقی عورت کو بھی کیا کہیئے کہ لاکھ ستانے کے باوجود بھی شوہروں کے اشاروں پر ناچتی ہیں۔ شیبا جب پڑھانے جاتی تھی تو ادھکیش جی اس سے اس انداز میں بات کرتے ہیں، جس کے بین السطور سے بہت سی الگ تھلگ باتیں جھلکتی تھیں، مگر شیبا کا کمال دیکھیے کہ اس نے اپنے آپ کو ادھکیش جی کے ناپاک ارادوں سے محفوظ رکھا۔

اس واقعہ میں کئی ایک پہلو توجہ طلب ہیں، سیاست کی نیرنگیوں میں عورتوں کا حسن

مزید رنگ بھر دیتا ہے، وہ اس طور پر بھی کہ جاہل مرد تو الیکشن جیت جاتا ہے، مگر جب ادائے فرض منصبی میں تعلیم کی کمی آڑے آتی ہے تو ایسے موقع پر عورتوں کا استعمال کرنے لگتا ہے، جیسا کہ اس ناول میں بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ اس واقعہ کے بعد کیا ایسا نہیں لگتا ہے کہ سیاسی نظام میں کچھ ایسا کیا جائے کہ تعلیم کی اہمیت وافادیت بھی اجاگر ہو اور تعلیم یافتہ شخص کو ہی سیاسی گلیاروں میں آنے کی اجازت دی جائے، ہوسکتا ہے کہ کسی کے دل میں یہ خیال آئے کہ سیاست میں آنے کے لئے تعلیم ضروری قرار دیا جانا جمہوریت کی حد بندی ہے، چنانچہ ایسے لوگ ذہن نشیں کرلیں کہ یہ حد بندی ہرگز نہیں، البتہ جمہوریت کے استحکام کی صورت ہے۔

اس ناول میں جہاں شوہر سے دوری بیوی کے حالات زندگی کے تناظر میں معاشرہ کے لئے ایک پیغام ہے، وہیں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی کہ آخر پڑھے لکھے افراد ملک چھوڑ کر کہیں دوسری جگہ کیوں چلے جاتے ہیں؟ روشن دماغ دوسرے کے لئے کیوں کام کرنے لگتا ہے؟ مضبوط قواہ دوسرے کے خواب سنجونے میں کیوں لگ جاتا ہے؟ دور اندیشی دوسروں کے لئے کیوں وقف ہو جاتی ہے؟ شاداب بھی تو روشن دماغ تھا اور اس کے ساتھ وہاں موجود افراد بھی انجینئر تھے، اعلیٰ تعلیم یافتہ تھے، باوجود اس کے بیرون ملک جاکر ایسے کام میں لگے ہوئے تھے، جو کسی نہج سے ان کے لئے مناسب نہیں تھا، اس مجبوری کی وجہ کو بھی ناول نگار بڑے حسین انداز میں دکھاتا ہے، سب سے بڑی وجہ بدعنوانی قرار دی گئی کہ اس کے بغیر سرکاری نوکریوں کا ملنا محال ہی نہیں، ناممکن ہے اور اچھا پڑھ لکھنے کے بعد بھی پرائیویٹ سیکٹر میں اتنی معمولی تنخواہ ملتی ہے، جتنی کہ بلکہ اس سے زیادہ ہی طالب علمانہ زندگی میں فی ماہ خرچ کردیا جاتا ہے، اس لئے ملکی آزادی کی پربہار فضا چھوڑ کر اچھے پڑھے لکھے افراد غیر ممالک چلے جاتے ہیں، اگر جو کوئی معمولی تنخواہ پر ہندوستان میں رک جاتا ہے تو دیگر بدعنوانی میں پھنس کر

اس کا اعلی دماغ پانی کو دودھ اور کیروسین کو ڈیزل بنانے میں لگ جاتا ہے، اس کے پاس اس بدعملی کے علاوہ کوئی چارہ بھی تو نہیں رہ جاتا ہے۔

اسی کے ساتھ ملک میں رائج تعصب پر مبنی انٹرویو بھی ہے، جس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی کہ مسلم اداروں کا نام آتے ہی انٹرویو لینے والوں کا دماغ کیسے خراب ہو جاتا ہے اور نوکری کا خواب سجائے مسلم امیدوار بس کف افسوس مل کر رہ جاتے ہیں۔

اس ناول میں معاشرہ میں بدلے کے تحفہ تحائف پر بھی تنقید کی ایک جھلک ہے، بالعموم ایسا ہی ہوتا ہے کہ جو کوئی کسی کو کچھ دے تو آج لینے والا کل دینے والوں کو مزید واپس کرنے کی فکر میں ڈوب جاتا ہے، جو کہ ایک انتہائی غلط روش ہے، گویا یہ تحفہ نہیں، ایک ''اذیت ناک قرض'' ہے۔

اس میں ایک ایسا درد بھی ہے، جو ہر ایک کو اپنی طرف کھینچتا ہے، وہ یہ کہ کوئی لڑکا بیرون ممالک جانے کا ارادہ اسی وقت کرتا ہے، جب بہت سے مسائل سامنے ہوتے ہیں اور ان کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی ہے، اپنے والدین کو پریشانیوں میں مبتلا دیکھ کر دل پر پتھر رکھتا ہے پھر نم آنکھوں سے وطن چھوڑ کر کمانے چلا جاتا ہے، وہ بھی کرایہ قرض لے کر، جب اس کی کمائی سے حالات سازگار ہوتے ہیں، مسائل کے بادل چھٹ جاتے ہیں، اس کے باوجود گھر والے اپنے لخت جگر کو یہ نہیں کہتے کہ بس آجاؤ، حالات اچھے ہو گئے ہیں، پریشانیوں سے نجات مل گئی ہے، اس ناول کے مرکزی کردار شاداب کے ذہن میں بھی یہی باتیں گونجتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ کاش گھر والے اسے بلالیں، کیوں کہ وہ یہاں ایسا کام کر رہا تھا، جسے بتانے پر بھی لوگ یقین نہیں کرتے تھے، بالآخر وہ ملک واپس آنے کا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور یہ سوچتا ہے کہ جب کسی کو میری کوئی ضرورت نہیں، نہ بیوی کو اور نہ ہی والدین کو، تو ملک جانے کا کیا فائدہ۔

شیبا حساس طبیعت تھی، زبان کی شیرینی اسے ہر درجہ عزیز تھی، یہی وجہ تھی کہ بابو جان کی اردو اس کے کانوں میں رس گھولنے کے بجائے پورے بدن میں کڑواہٹ پھیلا دیتی تھی، کیونکہ وہ اپنی اردو کا رعب شیبا پر جمانے کے چکر میں اردو کا گھلا گھونٹ دیتا تھا۔ اس کی اردو کے متعلق شیبا ایک خط میں شاداب کو کچھ یوں لکھتی ہے:

''میری زان! تجھ پر بابو زان کربان! تیری روپ ایسی کہ فول بھی دیکھے تو سرما جائے، چاند کو پشینہ آجائے۔''

آپ کو یہ سن کر ہنسی آرہی ہوگی مگر میں تو ہنس بھی نہیں سکتی، جب کبھی ان کے اندر یہ احساس زور مارتا کہ ان کی بیوی تعلیم یافتہ ہے تو اس وقت وہ بہت کنشس ہوکر بولتے ہیں اور اتنا کنشش ہوجاتے ہیں کہ س، ش، ک، ق اور گ، غ میں بدلنے لگتے ہیں، عجب طرح کے لہجے میں جب وہ اس طرح کے جملے نکالتے ہیں:

'شنو سیبا! میں جیادہ پڑھا لکھا نہیں ہوا تو کیا ہوا، پڑھے لخوں جیسا شمجھ تو رکھتا ہوں، میں کسی شے کم نہیں، اب سادابو ہی کو لے لو، اتنا پڑھ لخ گیا ہے، مغر کیا وہ میرا مکابلہ کرسکتا ہے، شات زنم میں بھی کیا میرے برابر روپیہ کما سکتا ہے، میری پوجیشن کو پہنچ سکتا ہے۔

اس وقت مجھ پر کیا گزرتی ہے، میں ہی جانتی ہوں''۔ (صفحہ 46,47:)

اس ناول میں طریقۂ تعلیم پر بھی چوٹ ہے، وہ اس طرح کہ آج اساتذہ طلبا کے معیار کے مطابق تعلیم نہیں دیتے ہیں، بلکہ اپنی قابلیت بگھارنے کے لئے معیار سے اوپر کی باتیں کرتے ہیں، ایک خط میں شیبہ لکھتی ہے:

''.......میں نے اس کے لئے ایک دوسری تدبیر نکالی کہ اس کے واسطے تین تین ٹیوٹر لگادئے، تاکہ زیادہ سے زیادہ اس کا وقت تعلیمی ماحول میں گزرے اور اس کے کان میں صحیح اور معیاری لفظ داخل ہوں، اس

تدبیر کے پیچھے ایک منطق یہ بھی پوشیدہ تھی کہ وہ گھر والوں سے بھی کم مل پائے اوراس کی زبان اپنے ماحول کے اثرات سے محفوظ ہو جائے، اس ترکیب سے اس کی زبان کے تحفظ کا مسئلہ تو حل ہو گیا مگر دوسرے مسائل اٹھ کھڑے ہوئے، تین تین لائق فائق ٹیوٹروں کی عالمانہ گفتگو اور اس کے طریقہ تدریس وطرز اظہار سے اس کے نازک اور کچے ذہن پر غیر ضروری بوجھ پڑنے لگا، علم کے مسلسل دباؤ سے ان کی نفسیات بگڑنے لگی، طرح طرح کی پیچیدگیاں اورخرابیاں پیدا ہونے لگیں، وہ چڑ چڑانے لگا، بات بات میں الجھنے لگا، رفتہ رفتہ اس کے چڑ چڑے پن میں اضافہ ہوتا گیا اور اس سے میری الجھنیں بڑھ گئیں'' (صفحہ:52,53)

یہ ہے غضنفر کا ناول ''شوراب'' جس میں معاشرہ بولتا ہے۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت تو یہی ہے کہ معاشرہ کے مسائل میں ڈوب کر لکھتے ہیں، اسی لئے ان کے ناولوں کا درد ہر ایک کو اپنا درد محسوس ہوتا ہے، ان کی یہ خصوصیت بھی دل کو چھو جاتی ہے کہ آج کے رنگین ماحول میں عشق کا راگ نہیں الاپتے ہیں، ورنہ تو آج ہر ایک تخلیق میں عشق ومحبت کا عنصر کسی نہ کسی سطح پر موجود ہوتا ہے، تخلیق کار غیر ضروری طور پر بھی اس کی ایک جھلک دکھا دینے کی کوشش کرتا ہے، مگر غضنفر کے ناول میں ہمیشہ سچا واقعہ تخیل کے رنگ میں رنگ کر آب دار نظر آتا ہے، اگر وہ چاہتے تو اس ناول میں بھی تخیلاتی عشق کی نغمہ سرائی کر سکتے تھے۔

سچ! یہ ناول بھی معاشرہ کا آئینہ دار ہے، مگر چند باتیں کھٹکتی ہیں، مثلاً___ پہلی دفعہ سعودی جانے سے قبل شاداب شادی شدہ تھا، فردوس اس کی بیوی تھی، مگر سعودی جانے کے بعد شیبا سے جو خط وکتابت ہوتی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شادی شدہ نہیں ہے، کیونکہ ایک دفعہ شیبا لکھتی ہے کہ آپ کے گھر والوں نے آپ کی شاری کے لئے لڑکی ڈھونڈ لی ہے، اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ وہ شادی شدہ نہیں تھا، کیا یہاں

یہ اشارہ ہے کہ وہ دوسری شادی کا خواہشمند تھا؟۔

جہاں موضوعات کے اعتبار سے یہ ناول انتہائی دلچسپ ہے، وہیں زبان و بیان کے لحاظ سے بھی لائق داد و تحسین، اس میں تخیل و نازک خیالی ہے تو حسین منظر نگاری بھی، مکالمہ میں چاشنی بھی ہے اور سلاست و روانی بھی، البتہ پروف کی بے شمار غلطیاں ہیں اور ایک دو جگہ تذکیر و تانیث کی بھی۔

مانجھی کی پتوار

صاحب کتاب نے کوزے میں سمندر نہیں ”سنگم“ میں دنیا کو سمو دیا ہے۔

”مانجھی“ ایک ایسا ناول ہے، جو معاشرہ کا بھرپور عکاس ہے۔ اس میں درد ہے، حقیقت ہے، کسک ہے، احساس ہے، عورتوں کی آہ ہے اور ان کی بے راہ روی بھی، مردوں کی بدچلنی ہے تو میڈیا کی بے سمتی بھی، جذبات ہیں تو توہم پرستی بھی۔ زبان صاف، شستہ، شگفتہ اور مکالمہ چست درست ہے، اسی طرح منظر نگاری بھی دلآویز۔

اس کی کہانی کچھ یوں ہے کہ وی ان رائے نے الہ آباد آنے کے بعد اپنے بھائی دھرم ناتھ سے سنگم گھوم آنے کی خواہش ظاہر کی ہے، بھائی نے اجازت دی، بھابھی نے کچھ توشۂ راہ دیا، وی ان رائے سنگم دیکھنے گئے اور ملاحوں میں سے سب سے مہنگے ملاح کی کشتی کو پسند کیا، ملاح سے اس بیچ یوں تو بے شمار باتیں ہوئیں، جو سبق آموز تھیں ہی، مگر تین کہانیاں جو اس نے سنائیں، ان میں بہت درد ہے، دو میں تو عورتوں کی مظلومیت کے ساتھ ساتھ ان کی بہادری اور نفسیات ہیں، اور تیسری کہانی، جسے کہانی نہ کہنا ہی بہتر ہے، بڑھتی آبادی کا المیہ ہے۔ یہ ملاح ہی دراصل 'ویاس مانجھی' ہے ،جس کے نام سے ہی یہ ناول موسوم ہے۔

'ویاس مانجھی' بلاشبہ ایک ایسا کردار ہے، جس پر بہت لکھا جا سکتا ہے، ویاس ایک بلیغ ذہن اور بیدار مغز ملاح ہے، شاید وہ ملاحی نہ کرتا تو نہ جانے کتنے بے راہ رو

نوجوانوں کو سفینۂ حیات کی ناخدائی کا حوصلہ دیتا، بالفرض وہ کھاتے پیتے گھرانے سے نہ سہی، متوسط گھرانے سے بھی تعلق رکھتا تو اسے علم کی پیاس بجھانے کا مزید موقع ملتا، پھر کچھ لکھ پڑھ لینے کے بعد علم دوستی کے فروغ کے لئے کچھ ضرور کرتا، آج معاشرہ میں نہ جانے کتنے بچے مانجھی کی طرح ہی غربت کی وجہ سے حصولِ علم سے محروم ہیں۔ غربت کی بھٹیوں میں نہ جانے کتنی امیدیں جل رہی ہیں، علم کی پیاس بجھانے کے لئے نہ جانے کتنی تمنائیں مچل رہی ہیں، مگر سرمایہ کی قلت کی بنا پر اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لیے بے شمار والدین کا خواب شرمندہ تعبیر نہیں ہو پا رہا ہے۔

تاہم مانجھی کے کردار نے یہ بھی سبق دیا ہے کہ غربت حائل ہو تو تعلیم سے سرمو انحراف ہی نہ کرلیا جائے، جیسا کہ آج ہو رہا ہے، بلکہ جہاں تک ہوسکے علم کی پیاس بجھانے کے لئے کچھ نہ کچھ پڑھتے ا کرتے رہنا چاہئے، جیسا کہ مانجھی نے مہابھارت کا مطالعہ کیا تھا اور متعدد وجوہات کی بنیاد پر کہانی پڑھنے کا شوق ملاحی کے زمانے میں بھی باقی تھا، یہی وجہ تھی کہ ایک غیر معمولی آدمی کے ساتھ پورے سفر میں تبادلۂ خیال کرتا رہا، وہ بھی ایک مفکر کی طرح۔

پھر یہ بھی دلچسپ پہلو ہے کہ تمام ملاحوں سے زیادہ مانجھی کی کشتی کی قیمت ہزار روپیہ کیوں تھی؟ مبہم انداز میں اس کی وضاحت کے لئے یہی کافی ہے ''سستا بار بار، مہنگا ایک بار''۔

ناول ''مانجھی'' میں اعتدال پسندی ہر جگہ نمایاں ہے، جو اس کی مقبولیت کی خاص ضامن ہے۔ اگر اس میں عورت مظلوم و مقہور نظر آتی ہے تو اس کی بہادری و چالاکی بھی اپنے جلوے بکھیرتی ہے، اگر اس میں عورتوں کے جسم کی نمائش کے تعلق سے مردوں کو قصور وار ٹھہرایا گیا ہے تو عورتوں کی بے راہ روی بلکہ ہر کام کے لئے اس کی رضامندی ____ کو نشانۂ تنقید بنایا گیا ہے۔ مثلاً ویاس مانجھی کی زبانی جو پہلی ____

کہانی بیان کی گئی ہے، اس میں جہاں گھسیارے گھسیٹے رام کی بیٹی راج کماری بنتے ہی تین بڑے کام کے لئے یک دم مامور کردی جاتی ہے، وہاں ایک اعتبار سے مظلوم لگتی ہے، مگر تینوں کام کے لئے 'حامی' بھرنا اور انہیں عملی جامہ پہنانا اس کی چالاکی اور بلند حوصلگی کی دلیل ہے اور شوہر کی اطاعت شعاری کا جذبہ بھی قابلِ تحسین ہے۔ اسی طرح اشتہارات میں جہاں عورتوں کے جسم کی نمائش کے لئے مرد ذمہ دار نظر آتے ہیں اور یہ شکوہ ہوتا ہے ''اشتہاروں میں عورتوں کے جسم کو ہی کیوں دکھایا جاتا ہے؟ کہیں کسی اشتہار میں عورت کا دماغ کیوں نہیں آتا ہے'' وہیں یہ بھی ہوتا ہے ''مگر سچ تو یہ ہے کہ اسے سونپے گئے کاموں میں یہ اس قدر منہمک دکھائی دیتی ہے کہ جیسے ان کاموں میں اس کی مرضی شامل ہو، بلکہ اس کی پسند اور خواہش کا دخل ہو، کہیں یہ بات تو نہیں کہ عورت کی سرشت میں یہ بات بٹھا دی گئی ہے کہ اسے ویسا ہی کرنا ہے جیسا کہ مرد کا عندیہ چاہتا ہے''۔ (مانجھی: ص 47,48,50)

مانجھی کی دوسری کہانی کے تناظر میں مانجھی اور وی ان رائے کا مکالمہ بھی کچھ ایسا ہی ہے، جو مرد و عورت کی ذہنیت کو اجاگر کرتا ہے:

وی ان رائے:

''......دلچسپ بات اس کہانی میں یہ ہے کہ یہ بھوک صرف راجا کو ہی پریشان نہیں کرتی تھی بلکہ اس بھوک سے بہو بھی بے چین تھی''۔

''بہو کس طرح بھلا'' وی ان رائے کے اس تبصرے میں دلچسپی لیتے ہوئے ملاح نے پوچھا:

''وہ اس طرح کہ اسے بھی یہ گوارا نہیں تھا کہ اس کے اوپر کوئی اور آجائے، اس کے اختیارات یعنی پاور اس کے ہاتھ سے نکل جائیں، اسے سرتاپا کی اتنی فکر نہیں تھی جتنی کہ اپنے ہاتھ سے راج محل کی چابیاں چھن جانے کی

چنتا تھی۔ اس کا اصل دکھ اپنی حیثیت، طاقت اور ستا کے مٹ جانے کا تھا، راج محل میں رہتے ہوئے بھی راج پاٹ سے بے دخل اور بے وقعت ہو جانے کا تھا ، یہ دکھ یہ چنتا، ستا اور شکتی کی بھوک ہی تو ہے"۔ (مانجھی:ص 72)

اسی کے ساتھ ذیل کی عبارتوں میں اعتدال پسندی کے تناظر میں اہم حقائق سامنے آئے ہیں۔

"جسم کی بھوک کے سلسلے میں ایک حیران کر دینے والا پہلو یہ بھی ہے کہ یہ بھوک طرح طرح کا بھوجن چاہتی ہے، الگ الگ سواد والے بھوجن کی اِچھا رکھتی ہے، یہ اور بات ہے یہ اچھا آسانی سے پوری نہیں ہوتی اور بعض بندھنوں اور کچھ دباؤ کے کارن اسے صرف ایک ہی طرح کے کھانے پر قناعت کرنی پڑتی ہے"۔

اس نکتہ پر آتے ہی وی ان رائے کے ذہن میں کچھ عورتیں ابھر آئیں جن کی شادیاں ہو چکی تھیں، جن کے شوہر بھی اچھے اور صحت مند تھے، جن کے گھروں کے سنسکار بھی کافی مضبوط تھے، وہ سنسکاری بھی تھیں اور جن میں سے زیادہ تر مذہبی تھیں اور اپنے دھرم اور مذہب کے مطابق پوجا پاٹھ بھی خوب کیا کرتی تھیں، مگر یہ ساری عورتیں اپنا سواد بدلنا چاہتی تھی اور بدلتی رہتی تھیں، ایسی عورتوں کی تعداد روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ (صفحہ:78,79)

"مگر حیرانی اس وقت دور بھی ہو جاتی، جب کچھ ایسے واقعات ان کے سامنے آن کھڑے ہوتے جن میں غیر مرد کے تصور سے بھی عورتیں کانپ اٹھتی تھیں، عورتوں نے اپنی جانیں دے دی تھیں، مگر کسی پرائے مرد کو ہاتھ نہیں لگانے دیا تھا، غریب، نادار، لاچار، محتاج عورتوں نے بھی اپنی آبرو بچانے کے لئے بڑے بڑے تحفے تحائف اور مال و زر پر لات ماردی، کمزور اور ناتواں عورتیں بھی اپنی عزت کے تحفظ کے لئے بڑے بڑے جابروں سے جا ٹکرائی تھیں۔"

مذکورہ دونوں پیراگراف میں جہاں بدچلن عورتوں کا خیال آیا ہے وہیں پاکباز عورتوں نے اپنی موجودگی درج کرانے کی کوشش کی ہے، گویا یہ بھی ایک اعتدال ہے۔

عورتوں کی خامیوں کو اجاگر کرنے کے بعد یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی کہ مرد کس طرح بے راہ رو ہوتے ہیں، یہاں تک کہ اپنی بیش قیمت جوانی شادی سے قبل ہی برباد کر دیتے ہیں، جس کا خمیازہ عورتوں کو بھگتنا پڑتا ہے، جیسا کہ راج کمار کی بیوی کو نہ چاہ کر بھی سسر کے مقدس رشتہ کو داغدار کرنا پڑا۔

اسی طرح پہلی کہانی میں مرد کا یہ کردار بھی کس قدر افسوناک ہے کہ چند لمحوں میں وہ غیر عورتوں کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، گھسیارے کی بیٹی نے جس طرح اپنے 'شوہر کی شرط' پوری کرنے کے لئے ایک کھیل کھیلا کہ فوراً وہ اس کی طرف مائل ہو گیا، اس وقت اس کو اپنی بیوی کے حق کا کوئی خیال نہیں آیا، مزید اس میں مردوں کی بے راہ روی اس وقت اجاگر ہوتی ہے، جب بیوی 'گھسیارے' کی بیٹی تینوں کا کام مکمل کرنے کے بعد اپنے شوہر راج کمار کو اطلاع دیتی ہے کہ تینوں شرط پوری ہو گئی ہے، یہ سن کر راج کمار آتا ہے، بیوی سے ملتا ہے، مگر پھر بھی اسے تشفی نہیں ہوتی اور بیوی کے ذریعہ تلاش کی گئی راج کماری کے پاس جانے کو بیقرار ہو جاتا ہے۔

مردوں کے بعد پھر عورتوں کی کمیاں اس طرح اجاگر کی جاتی ہیں:

"......یہ تصویر ایک بدیسی گوری جوان چھریرے بدن اور تیکھے ناک نقش والی خوبصورت لڑکی کی تصویر تھی، لڑکی سر سے پا تک مادر زاد ننگی تھی، لباس کی جگہ اس نے اپنے پورے جسم پر مٹی کا لیپ چڑھا رکھا تھا، بظاہر اس نے یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ وہ ننگی نہیں ہے، بلکہ اس نے ایک نئے انداز کا لباس پہن رکھا ہے اور اس کے ایک ایک انگ پر مٹی کا بستر چڑھا ہوا ہے اور وہ کہیں سے بھی ننگی نہیں ہے، لیکن مٹی کے لیپ نے خشک ہو کر اس کے جسم کو اتنا کس دیا تھا کہ ایک ایک انگ کمان کی طرح تن گیا تھا

اور ہر ایک کمان سے تیر چھوٹ رہا تھا۔

تصویر کو دیکھنے کے لئے اس کی جانب لوگوں کا ہجوم امنڈ پڑا تھا، سادھو سنتوں کی نگاہیں بھی اسے تاک رہی تھیں، گنگا کی طرف جاتے ہوئے لوگ بھی اسے مڑ مڑ کر دیکھ رہے تھے۔

تصویر کے ساتھ ساتھ یہ سب مناظر بھی کیمرے کے فوکس میں آ گئے تھے، تصویر کے ساتھ اس میگزین میں اڈیٹر کا ایک نوٹ بھی چھپا تھا......

ایڈیٹر کے اس نوٹ میں اور بھی بہت کچھ تھا مگر وی ان رائے کی نگاہیں یہ ڈھونڈنے میں لگی ہوئی تھیں کہ اس لڑکی کے ننگے پن کے خلاف سنگھ نے احتجاج کیا؟ کس منڈلی نے اپنا ورودھ پرکٹ کیا؟ کس کس نے برا مانا؟ کس کس نے برا بھلا کہا

".......

کیا وہ لڑکی یہ دکھانا چاہتی تھی کہ وہ آزاد خیال ہے؟ وہ ایک ایسی تہذیب کی پروردہ ہے جہاں فرد پر کسی قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے، کوئی بندھن نہیں ہے، اسے ہر طرح کی آزادی حاصل ہے، وہ اپنے اوپر شرم وحیا کی چادر پسند نہیں کرتی؟ اسے مردوں سے ڈر نہیں لگتا ہے۔ (مانجھی:107,109)

ان تمام باتوں کے ساتھ اس کا اعتراف بھی ہے کہ عورتوں کے پاس دماغ بھی ہے، سوچنے سمجھنے کی لیاقت وصلاحیت بھی ہے، مگر وہ دماغ سے زیادہ جسم کی نمائش میں یقین رکھتی ہے۔

بدیسی لڑکی کے کردار میں جہاں سادھوں سنتوں کی حقیقت سامنے آ گئی ہے، وہیں میڈیا کا غیر ذمہ دارانہ رویہ بھی کھل کر سامنے آیا ہے کہ اس نے سب کچھ لکھا، مگر ننگے پن کے خلاف کچھ نہیں، اس نے ساری باتیں تو کہہ دیں مگر کسی رپورٹر میں اتنی جرات نہیں کہ کسی سے برہنگی کی وجہ دریافت کرے۔

ضمناً اس ناول میں ایسی ایسی چھوٹی باتوں کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے، جن کی طرف بالعموم نگاہ نہیں جاتی ہے۔ مثلاً، بیرون ممالک میں ہندوستانیوں کے تئیں کیا معاملات کئے جاتے ہیں، ہندوستانیوں کے اوپر کیسی ترچھی نگاہیں ہوتی ہیں، مانو وہ مجرم ہو یا دہشت گرد۔ توقیر علی سے وی ان رائے کا دلچسپ مکالمہ اس تناظر میں بہت خوب ہے۔

اسی طرح اس میں ائمہ اور متولیان مساجد کی صورتحال پر بہت خوب روشنی ڈالی گئی ہے کہ کس طرح متولی حضرات اماموں پر حکمرانی کرتے ہیں اور بیچارے امام کس طرح گھٹ گھٹ کر زندگی تمام کرتے ہیں، مگر یہی امام مساجد کو خیر باد کہہ کر سائڈ سے کچھ ڈگریاں حاصل کر لیتے ہیں تو روزی روزگار کے سنہری مواقع دستیاب ہوتے ہیں، مگر دین سے دوری ہونے لگتی ہے، واقعی سچ، یہ بھی مسلم معاشرہ کا ایک بڑا المیہ ہے۔

اس میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ جہاں کبھی لوگ مذہبی رسومات کی ادائیگی کے لئے جایا کرتے تھے، وہی جگہ آج عریانیت وفحاشی کا اڈہ بنتا جارہا ہے اور ایسے بے شمار کام، جس میں اگر خلوص نیت ہو تو ثواب بھی ملے گا، محض تفریح طبع کے لئے کئے جانے لگے ہیں، مثلاً، پرندے کو پونیہ کی نیت سے دانے دینا بہتر ہے، مگر لوگ صرف تفریح کی غرض سے اب دانے دیتے ہیں، کیونکہ اس کی چھین جھپٹ دیکھنے والوں کو اچھی لگتی ہے۔ ان تمام باتوں کے ساتھ یہ بھی واضح ہوتا ہے سنگم کے سیر کے دوران سیاح پرندوں کو جو دانے دیتے ہیں، وہ دانے صرف پرندوں کے پیٹ کی آگ ہی نہیں بجھاتے، بلکہ اسی بہانے بے شمار لوگ روزی روزگار سے جڑ گئے ہیں اور کمپنی مالکان دانے کے نام پر حکومت سے مراعات بھی کس طرح حاصل کرتے ہیں۔

اس ناول میں جہاں راج گھرانہ کی رسم ورواج بلکہ اندھے قانون پر ضرب لگائی گئی ہے، وہیں جمہوریت کی حد سے زیادہ آزادی کو بھی نشانہ تنقید بنایا گیا ہے۔ راج

گھرانے میں کیسے بڑے بیٹوں کی اولاد کو اہمیت دی جاتی ہے اور اس کے لئے ہر قیمت چکانے کے لئے پورا گھرانہ تیار رہتا ہے۔ لکھنو کی ایک جھلک دکھا کر بہت عمدگی سے اس پہلو کو بھی اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

بڑھتی آبادی کے مسئلہ کو زیر بحث لایا گیا کہ ایک چھوٹے کمرہ میں پوری فیملی رہنے کی وجہ سے جائز طریقہ سے بھی جنسی تسکین ممکن نہیں ہو پا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ نوجوان جوڑے سیر سپاٹے کے لئے ہی نہیں بلکہ جنسی خواہش کی تسکین کے لئے تاریخی مقامات کا انتخاب کرنے لگے ہیں۔ جہاں بڑھتی آبادی کا مسئلہ زیر بحث ہے وہیں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ آج لوگوں کی جان کتنی سستی ہوگئی ہے کہ بات بات پر آدمی آدمی کو موت کے گھاٹ اتار دیتا ہے اور پیٹ کی آگ کتنی شدید ہوتی ہے کہ پاکیزہ رشتے کو کھا جاتی ہے، نیکی کو خاکستر کر دیتی ہے۔

گنگا۔جمنا کے سنگم کو سامنے رکھ کر اتحاد کا پیغام دینے کی بھی کوشش کی گئی ہے، جو کہ ممالک کے ساتھ ساتھ افراد کے لئے انتہائی اہم ہے کہ گنگا۔جمنا سنگم میں ملتے ضرور ہیں، مگر دونوں کی راہ الگ ہے، دونوں کو اپنے ہی کام سے سروکار ہے۔

الغرض ملاح ہونے کے باوجود بھی مانجھی کے بلیغ ذہن نے گنگا۔جمنا اور سرسوتی کے سیر کے دوران ان چھوٹی موٹی باتوں کی طرف توجہ دلائی۔ اس ناول کی زبان بھی صاف ہے، سشتہ اور شگفتہ ہے اور مکالمے بھی چست درست۔

مکالمہ اور منظر نگاری کی ایک جھلک:

> ''دی ان رائے نے ملاح کے ہاتھ سے پیکٹ لے کر ان میں
> سے ایک مٹھی دانہ پانی میں دور تک بکھیر دیا۔
> پرندوں کا غول ترقی یافتہ ملکوں کے جنگجو طیاروں کی مانند دانوں
> پر جھپٹ پڑا، کچھ پرندے پانی کے اندر بھی دانوں کو اپنی چونچ میں پکڑ لائے،
> جیسے وہ پرندے نہیں، جدید طرز کی بنی پنڈوبیاں ہوں۔

صاحب! اس باردانوں کو ہوا میں اچھالئے۔

'ایسا کیوں؟'

'اچھالئے تو سہی'

'اچھا' وی این رائے نے اس باردانے خلا میں اچھال دئے۔
پرندوں نے ان دانوں کو ہوا میں ہی روک لیا، ایک دانے کو بھی
نیچے نہیں گرنے دیا، ایسا لگ رہا تھا، جیسے وہ پرندے کسی زویا سرکس سے آئے
ہوں جہاں اس فن میں انہیں برسوں تربیت دی گئی.....

'دانوں پر جھپٹتے ہوئے انہیں دیکھ کر بڑا اطمینان ملتا ہے صاحب'

'اطمینان کیوں؟' وی ان رائے نے ملاح کی طرف حیرت سے
دیکھتے ہوئے پوچھا:

'اس لئے کہ اس دھرتی پر کچھ ایسے بھی دیس ہیں جن کے بھوکے
پنچھی اپنا پیٹ بھرنے ہمارے یہاں آتے ہیں''۔

ناول کی خصوصیات چند لفظوں میں کچھ اس طرح بیان کی جاسکتی ہیں:
پہلی خصوصیت: زبان وزبان، اردو ہندی کا آپس میں شیروشکر ہو جانا۔
موضوع: بہت ہی وسیع کینوس پر پھیلا ہوا ہے۔ آپسی اتحاد و اتفاق کی دعوت،
مردوزن کا سماجی تعلق اس کا بنیادی موضوع ہے۔
دوسری خصوصیت: آپسی اتحاد، جس طرح گنگا جمنا ایک ساتھ بہتی ہے، باوجود اس
کے دونوں کی ظاہری خصوصیت پانی کے اعتبار سے الگ الگ ہے مگر اپنی خصوصیات کو
بچاتے ہوئے وہ کس طرح ایک ساتھ چلتی ہے، یہ اس ناول کا بہت ہی باریک نکتہ ہے
کہ ہم ہندوستانی بھی چاہیں تو گنگا و جمنا کی طرح اپنی الگ الگ خصوصیت کے باوجود
بھی ایک ساتھ سفر طے کر سکتے ہیں۔
تیسری خصوصیت: چھوٹی چھوٹی کہانیوں سے ایک بڑی کہانی کا پلاٹ/ خاکہ تیار

کرنا کوئی معمولی بات نہیں، غضنفر نے جس طرح سے چھوٹی چھوٹی کہانی کو اپنے ناول کا حصہ بنایا ہے یہ انہیں کا ملکہ ہے۔

چوتھی خصوصیت: غضنفر صاحب نے اپنے دوسرے ہم عصر ناول نگاروں کے برعکس لفاظی اور غیر ضروری چیزوں سے اپنا دامن بچایا ہے، جبکہ اس ناول کا پلاٹ ایسا ہے کہ وہ چاہتے تو غیر ضروری قصوں میں الجھ سکتے تھے اور ناول کے صفحات میں اضافہ کر سکتے تھے، مگر انہوں نے کمال ہوشیاری سے ایک ماہر فنکار کی طرح صرف انہیں چیزوں کو اس ناول کا حصہ بنایا ہے جو اشد ضروری تھا۔

پانچویں خصوصیت: غضنفر صاحب نے ویاس مانجھی کی زبانی اپنے دل کی بات لوگوں کے سامنے رکھی ہے، یہ ویاس مانجھی کوئی اور نہیں خود غضنفر ہیں۔

ہندوستانی سماج میں تحلیل وِش کا منتھن

'وِش منتھن' کے مطالعہ سے "عمل کا ردعمل" اور "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" والی مثل کی عملی تفسیر سامنے آجاتی ہے۔

اس ناول میں ہندوستانی سیاست پر چھائی تعصب اور فرقہ پرستی کی گرد کو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کب کہاں، اس کی آگ دہک اٹھے اندازہ نہیں کیا جاسکتا ہے، اگر یہ کہا جائے کہ اس میں گجرات فساد کی جانب بھی ایک لطیف اشارہ ہے تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں۔

کامران عرف بٹو اور راجیش کے درمیان ہونے والے مقابلہ میں بٹو کامیاب ہوجاتا ہے، شکست خوردہ راجیش اپنے اندر احساس برتری کی دہکتی آگ پر قابو نہ پاکر بٹو پر نازیبا کلمات کے تیر چلانے لگتا ہے، شکست کا بادل چھانٹنے کے لئے راجیش نے جو کیا وہ "کھسیانی بلی کھمبا نوچے" کی عملی تفسیر ہے اور بٹو نے راجیش کے جواب میں تھپڑ چلانے کی جو کوشش کی ہے، وہ دراصل "عمل یا ایکشن" ہے، مگر اس کے بعد کامران کے اوپر لوگوں کے گھونسے اور مکے برستے ہیں، یہ ہے "ردعمل یا ری ایکشن"۔ اس ردعمل کی آگ یہیں پر ٹھنڈی نہیں ہوجاتی ہے، بلکہ ہر جگہ ناول میں اپنی غضبناکی دکھاتی ہے۔

مقابلے والے اس واقعہ میں چند ایک پہلو انتہائی توجہ طلب ہیں، وہ اس طور پر کہ راجیش نے شکست کے بعد جو حرکت کی وہ بہت ہی غلط قدم ہے، مگر اسی کے ساتھ ہی

وہاں موجود لوگوں نے بٹو کے ساتھ جو رویہ اپنایا، وہ تو اور بھی غلط ہے، گویا ان لوگوں نے اپنے عمل سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ ظالم اگر طاقتور ہو تو اس کی ہی حمایت کی جائے۔ راجیش کی پھبتی سے اس کا دل چھلنی چھلنی ہو ہی گیا تھا، لوگوں نے مزید تھپڑوں اور مکوں سے اس کی درگت بنادی، اس کا بدن سوج گیا تھا، چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔

مقابلہ کے وقت کا واقعہ اپنے آپ میں خود شرمناک تھا، مگر اس کی شرمناکی پر یہ کہا جاسکتا تھا کہ وہاں جنونی لوگوں نے چھوٹے سے مسئلہ کو طول دے دی تھی، مگر شکست خوردہ گروہ کے افراد نے پنچایت میں انا کی تسکین کے لئے سر عام بٹو اور اس کے والد کی جو بے عزتی کی، اس سے تو یہی اندازہ ہوتا ہے کہ ملک کے اقلیتی فرقہ کی ترقی اور کامیابی اکثریتی فرقہ کی آنکھوں میں کھٹکتی ہے، ان کی کامیابی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے ۔ گویا اس پنچایت کے مدنظر یہ کہا جاسکتا ہے کہ منصوبہ بند طریقہ سے بھی مسلمانوں کو رسوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ اس پنچایت، جس میں بٹو کے والد سے معافی منگوائی گئی، میں ہندوستانی عدالت پر بھی چوٹ ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہوگی، کیونکہ اس واقعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اگر مظلوم کمزور ہو تو اس کے حق میں مبنی بر انصاف فیصلے نہیں کیا جائے گا، جیسا کہ آج عدالت بھی رفتہ رفتہ فرقہ پرستی کی آگ میں بس جھلسنے والی ہے اور اقلیتوں کے تعلق سے نہ سمجھ میں آنے والے فیصلہ ہو رہے ہیں۔ کامران راجیش کے گھرانہ کے مقابلہ میں کمزور تھا، اسی لئے اس کے والد کو جھکنا پڑا، سر عام غلطی ماننا پڑی۔

اس نفرت و تعصب کی وجہ یہ ہے کہ مسلمان نمبر دو کے شہری ہیں یا باہری۔ مسلمان اپنے اوپر چسپاں اس لیبل کو اتار پھینکنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر سیاستداں انہیں کامیاب نہیں ہونے دیتے ہیں۔

چھوٹی عمر میں ہی بٹو جوانمردی کے ساتھ ہر جگہ یہ باور کرانے کی کوشش کرتا ہے کہ

ہم بھی ہندوستان میں برابر کے حقدار ہیں، ہم نے اور ہمارے پرکھوں نے اس چمن کو اپنے لہو سے زینت بخشی ہے، آج بھی ہم اپنے ملک کے حسن کو دوبالا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس کی بات، اس کی جوانمردی اور اس کے دلائل سیاسی گرد میں دب کر رہ جاتے ہیں۔ بٹو نے پنچایت میں بھی ہمت وحوصلہ سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہم باہری نہیں، یہ ملک ہمارا بھی ہے ___ :

"....مگر ہمارے بزرگ تو کئی پشتوں سے یہیں دفن ہیں،

بٹو نے نہایت ٹھہرے ہوئے لہجہ میں جواب دیا۔

'اور ان سے پہلے...'

وہ بھی یہیں کے ہوں گے'

'اور سب سے پہلے والے'۔" (صفحہ:23,24)

"___ 'تم نے تو چپی سادھ لی ہے'۔ معمر شخص نے بٹو کو مخاطب کیا۔

'میں نہیں مانتا'

'کیا نہیں مانتا'

'یہی کہ میرا کوئی بزرگ باہر سے آیا تھا'

'تم جھوٹ بول رہے ہو، اتہاس گواہ ہے کہ تمہارے پوروج باہر سے آئے تھے'

'میں جھوٹ نہیں بول رہا ہوں، میرے حساب سے میرے دادا، پردادا، سگودادا سب یہیں کے رہنے والے تھے'

'یہ ستیہ نہیں ہے، دنیا جانتی ہے کہ تمہارے بزرگ باہر سے آئے تھے'

'باہر سے آنے والا باہری نہیں ہو جاتا ہے'۔ بٹو نے اپنی نظریں معمر شخص کے چہرے پر جمادیں، جیسے اپنی پتلیوں کے آئینہ میں وہ انہیں

کچھ دکھانا چاہتا ہو۔'' (صفحہ 27,28)

''تم بہت بڑھ چڑھ کر بولنے لگے ہو'

'اس کے لئے آپ ہی مجبور کر رہے ہیں'۔

'دیکھو! ستیہ یہی ہے کہ تمہارے پوروج باہر سے آئے تھے
اس لئے تم بھی باہری ہو، یدی تم باہری نہیں ہو تو یہاں والوں کی طرح کیوں
نہیں رہتے'

'یہاں والوں کی طرح؟' چونک کر بٹوان کی طرف دیکھنے لگا۔

'ہاں، یہاں والوں کی طرح'

'یعنی ہماری طرح'

'ہماری طرح کس طرح؟ آپ کی طرح؟ ان کی طرح
یا ان کی طرح جو آپ کے پیچھے ہیں''۔

اس مکالمہ میں بٹو نے یہ بھی جواب دینے کی کوشش کی ہے کہ آخر مسلمانوں کے رہنے کے طور طریقے پر اعتراض کیوں ہے، ہندوستان میں سکھ بھی رہتے ہیں، عیسائی بھی، ان کے رہن سہن اور عبادتوں کے طریقے مختلف ہیں، مگر ان پر کوئی اعتراض نہیں، صرف مسلمانوں پر اعتراض کیسا کہ وہ ہندوؤں کی طرح رہیں، جیسا کہ معمر شخص نے کہا کہ اگر تم باہری نہیں ہو تو ہماری طرح رہو۔ اس کا مطلب تو یہ بھی نکالا جا سکتا ہے کہ سکھ یہاں کے نہیں ہیں، عیسائی یہاں کے نہیں۔

پھر بٹو کا یہ جملہ بھی 'باہر سے آنے والا باہری نہیں ہو جاتا ہے' انتہائی معنی خیز ہے، وہ اس طور پر کہ اس نے معمر شخص کی آنکھ میں آنکھ ڈال کر یہ کہنے کی کوشش کی ہے کہ ہندو بھی تو باہر سے آئے ہیں، کبھی نہ کبھی ان کے آبا واجداد بھی تو باہر سے ہی آئے ہوں گے، اس کا مطلب تو یہ نہیں نکلتا کہ ہندو بھی باہری ہیں، ناول نگار نے یہاں ایشیا کوچک کی تاریخ ناول میں سمونے کی کوشش کی ہے۔

کامران عرف بٹو اسی کالج میں زیر تعلیم تھا، جس میں اس معمر شخص کا پوتا بھی تھا، یہ مسئلہ اور بھی معمر شخص کے لئے عار کا سبب تھا کہ ایک مسلمان بھی اس کے بچوں کی طرح ایک اچھے اسکول میں پڑھتا ہے۔ بٹو سے اس کا ہر ایک ساتھی خوش تھا، اس کی اداؤں سے ہر ایک کو محبت تھی، بے شمار ہندو لڑکیاں بھی اس سے قربت بڑھانے کی کوشش کرتی تھیں، کوئی لڑکی اس سے بہن کا رشتہ جوڑتی تو کوئی دوست بننا چاہتی تھی، خود اس معمر شخص کا پوتا اس کا دوست تھا، ایسے ماحول میں ہندو لڑکے یا کسی لڑکی کو یہ خیال نہیں آتا کہ وہ باہری ہے یا نمبر دو کا شہری۔ ہر ایک کامران سے ایک اچھا انسان ہونے کے ناطے محبت کرتے تھے۔ ہندو لڑکیاں بٹو سے اس طرح ہم کلام ہوا کرتی تھیں:

''تمہارا کھیل دیکھنے میں میں روز لیٹ ہو جاتی ہوں، ڈیلی گھر پر ڈانٹ پڑتی ہے۔'

'تو کیوں دیکھتی ہو؟'

'اچھا لگتا ہے۔'

'کیا کھیل تمہیں اتنا اچھا لگتا ہے؟'

'کھیل نہیں'

'تو'

تمہارا کھیلنا'

'کیا میں اتنا اچھا کھیلتا ہوں

'ہاں بہت ہی اچھا، تم جب اچھل کر گیند پکڑتے ہو تو ایسا لگتا ہے کہ تم نے چاند کو پکڑ لیا ہے، اس وقت میں آسمان میں اڑنے لگتی ہوں''۔

''سنبھل کر کھیلا کرو، کہیں پاؤں ٹوٹ جاتا تو؟'

'تو کیا ہوتا'

'چاند میرے ہاتھوں سے پھسل جاتا، میرا آسمان میں اڑنا رک جاتا
''۔(صفحہ:45,46)

ان جملوں سے بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح بٹو سے ہندو لڑکیاں محبت کرتی تھیں۔ بٹو کی اسی دوستی سے اندازہ ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خلاف نفرت کی آگ ہر جگہ نہیں لگی ہے، ہر جگہ مسلمانوں کے تئیں تعصب نہیں ہے، مگر سیاسی نظام ہی کچھ ایسا ہے کہ تعصب اور فرقہ وارانہ روش کو شہہ دیتا ہے، جس سے کہ ہندوستانی فضا مکدر ہونے لگتی ہے، یعنی سیاست ہی مسلمانوں کے تئیں پاک صاف دل میں نفرت کا زہر گھول دیتی ہے۔ معمر شخص اور ان کے پوتے کے مکالمہ سے بھی ایسا ہی اندازہ ہوتا ہے، اس مکالمہ میں پوتے نے جو پتے کی بات کہی ہے، وہ واقعی برادرانِ وطن کے بہت سے سوالوں کا ایک مثبت جواب ہے۔

''....اچھا ہوا آپ نے خود ہی بٹو کی بات چھیڑ دی
، میں آپ سے پوچھنے والا ہی تھا کہ آپ نے اسے Punish کیوں کیا'

'اس لئے کہ اس نے قصور کیا تھا'

'کیا قصور تھا'

'اس نے ہمارے ایک بچے کو مارا تھا'

'لیکن اس نے یوں ہی تو نہیں مارا ہوگا، ضرور اس کا کوئی ریزن ہوگا'

'ریزن کیا! بچے نے اسے باہری کہہ دیا تھا، بس اس سادھارن سی بات پر اس نے تھپڑ مار دیا'

'بٹ بٹو از ناٹ آوٹ سائڈ گرینڈ پا، وہ یہیں کا رہنے والا ہے، لائک می اینڈ یو۔'

'سوٹھیک ہے، پر اس کے پوروج باہر سے آئے

تھے'

'پوروج منس'

'اوہ ! پوروج نہیں سمجھتے ، پوروج منس

'Ancesters,for For Fathers

'او، گرینڈ پا، کیا وہ سچ مچ باہر سے آئے تھے؟'

'نی سند یہہ، وہ باہر سے آئے تھے'

'نی سند یہہ؟ سوری گرینڈ پا! میری ہندی ذرا پوور

ہے'

'ان ڈوٹلی' اس بار معمر شخص نے ناگواری سے

جواب دیا'۔

'تھینک یو گرینڈ پا____ وہ کیا کرنے آئے تھے'

'اس دیش کو لوٹنے اور کیا کرتے'

'ہاں، اس Conutry کو لوٹنے'

'لوٹا'

'ہاں، خوب لوٹا، جی بھر کے لوٹا، دونوں ہاتھوں

سے لوٹا'

'عجیب بات ہے، لٹیرے تو لوٹ پاٹ کر کے چلے

گئے مگر اپنی سب سے Costly چیز کیوں چھوڑ گئے؟'

'کون سی Costly چیز'

'اپنی Progency''

'Progency' اس بار معمر شخص چونکا۔

'Generation گرینڈ پا!'

'او____ وہ گئے نہیں، وہ بھی یہیں رک گئے۔'

'تب تو ان کا لوٹا ہوا مال بھی یہیں رہ گیا ہوگا؟

معمر شخص سے اس سوال کا جواب نہ بن پڑا، وہ خاموش ہو گیا' گرینڈ پا' آپ کا Silence بتا رہا ہے کہ مال یہیں رہ گیا، اِٹ مینس کہ ان کی لوٹ پاٹ سے اس ملک کو ہارم نہیں پہنچا ہے۔'' (صفحہ:62،63)

''........اور سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ انہوں نے یہاں کی مہیلاؤں کی عزتیں لوٹیں'

'گرینڈ پا ہمارے لوگوں نے اپنی عورتوں کی عزتیں کیوں لوٹنے دیں؟ انہوں نے انہیں بچایا کیوں نہیں؟ اتنے زیادہ تو نہیں رہے ہوں گے کہ ان سے اپنی عورتوں کی عزت بچانا Impossible تھا، کہیں ایسا تو نہیں کہ جن عورتوں کی عزتیں لوٹیں، انہیں ہم بچانا ہی نہیں چاہتے تھے؟ سننے میں تو یہ بھی آتا ہے کہ ہم خود بھی ان (عورتوں) کی عزت سے کھلواڑ کیا کرتے تھے، اور ہمارے ہی ڈر سے وہ ان کی پناہ میں گئیں'

'یہ سب بکواس ہے۔' معمر شخص تمتما گیا۔ (صفحہ:64)

اس مکالمہ کا نکتہ بھی اپنے آپ میں ایک بڑا نکتہ ہے کہ دنو (پوتا) جو ابھی بچہ ہے، اس کا دل صاف ہے، مسلمانوں کے تئیں تعصب اور نفرت سے دل پاک ہے، مگر ظاہر ہے کہ جب دادا ایسی باتیں بچوں سے کریں گے تو ایک نہ ایک دن بچوں کے دلوں میں بھی یہ آگ لگ ہی جائے گی اور وہ بھی مسلمانوں سے نفرت کرنے لگیں گے، اس طرح آہستہ آہستہ ملک کی فضا مکدر ہوگی۔

اس مکالمہ کے بعد دادا جہاں یہ سوچتے ہیں کہ آخر ہماری نسل ہم لوگوں کی طرح کیوں نہیں مسلمانوں سے نفرت کرتی ہے؟ کیوں ہندو لڑکیاں مسلمانوں سے قریب ہوتی

ہیں؟ وہیں پوتا کے ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ آخر دادا کیوں مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں؟ اندازہ کیا ہی جاسکتا ہے کہ پوتا کے دل میں بھی نفرت کی آگ دہک سکتی ہے۔

پوتا کے خاموش کردینے والے جواب کے بعد دادا صرف اس غرض سے میٹنگ بلاتے ہیں کہ کیسے مسلمانوں کے تعلق سے نئی نسل میں تعصب بھرا جائے، کیوں کہ پوتے کا ہم خیال نہ ہونا ان کے لئے پریشانی کا باعث تھا۔

اس ناول میں ایک فرضی ڈرامہ 'ساگر منتھن' بھی ہے، جس کے مناظر تعصب سے زہر آلود ہیں، ساگر منتھن کے دیوی دیوتاؤں کا قصہ اس طرح ہے کہ منتھن میں بہت ساری چیزیں نکلی تھیں، مثلاً، دھنونتری، لکشمی، رمبھا، منتری، سنکھ، گجراج اور ششی ہلاک کردینے والے رتن تھے، اس لئے بھگوان شنکر نے ان زہر آلود چیزوں کو اپنے اندر اتار کر دنیا کو تباہی سے بچالیا، اب رہی بات امرت کی تو ایک راکشش نے پی لیا تھا، شنکر بھگوان نے یہ سوچ کر اس کا سر قلم کروادیا کہ وہ امر نہ ہوجائے، کیونکہ راکشش بدی کی علامت ہے، مگر اس ڈرامہ کے منتھن میں صرف برباد کردینے والے رتن ہی نکل رہے تھے، لاکھ کوشش کے باوجود بھی امرت نہیں نکلا، چنانچہ رشی گیانیشور سے پوچھا جاتا ہے کہ امرت کیوں نہیں نکل رہا ہے تو رشی کہتے ہیں کہ امرت پہلے ہی نکال لیا گیا ہے، وہ کسی انسان کے اندر ہے، مگر ابھی تک امرت پوری طرح گھلا نہیں ہے، اگر امرت لینا ہو تو اس انسان کو ختم کرنا ہوگا اور منتھن میں جو وش نکلے ہیں، انہیں بھی ٹھکانے لگانا ضروری ہے، ورنہ دنیا تباہ ہوجائے گی۔

اس ڈرامہ میں اس طور پر نفرت بھرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ امرت اب کسی راکشش کے اندر نہیں، بلکہ انسان کے اندر ہے، اور یہاں انسان سے مراد دلت یا مسلمان ہیں، گویا امرت لینا ہے تو مسلمانوں اور دلتوں کو مارنا ہوگا۔ اسی کے ساتھ یہ پہلو بھی ہے کہ بھگوان نے اصل ساگر منتھن میں زہر آلود چیز خود پی لی تھی، مگر اب کمزور

لوگوں کو پلانے پر سب متفق ہو گئے، گویا یہاں بھی مسلمانوں اور دلتوں کی طرف اشارہ ہے کہ وہ کمزور ہیں، چنانچہ مسلمانوں اور دلتوں کو ہی زہر آلود چیز پلائی جائے۔

یہاں پر یہ بات بھی انتہائی توجہ طلب ہے کہ مسلمانوں سے برادران وطن کی نفرت تو کسی حد تک سمجھ میں آتی ہے، کیونکہ مذہبی چپقلش ہے، مگر دلتوں سے آخر وہ کیوں نفرت کرتے ہیں؟ کیا وہ ہندو نہیں ہیں؟ کیا وہ بھی ان کی طرح ایک انسان نہیں ہیں ؟، گویا ہندو اپنے دیگر ہندو کے خیر خواہ نہیں، انہیں اپنوں سے اس قدر نفرت ہے تو دوسروں سے کیوں نہیں ہوگی؟۔

ناول نگار نے اس میں ہندی سے نوجوان نسل کی بے رغبتی بھی دکھانے کی کوشش کی ہے، سچ یہی ہے کہ آج ہندی سے بھی لوگوں کی طبیعت بیزار ہونے لگی ہے۔

'نی سند یہہ، وہ باہر سے آئے تھے'

'نی سند یہہ؟ سوری گرینڈپا! میری ہندی ذرا پوور ہے'

دادا نے عام فہم ہندی لفظ ''نی سند یہہ'' کا استعمال کیا ہے، مگر پوتا نہیں سمجھ پایا، اس سے ہی اندازہ ہوتا ہے کہ شاید نوجوان ائی نسل ہندی سے دور ہونے لگی ہے۔

'وِش منتھن' میں بھی غضنفر دگر ناولوں کی طرح اپنی خصوصیتیں برقرار رکھتے ہیں، ان کا دلنشیں بیانیہ قارئین کو اپنی طرف کھنچتا ہے، بیدی کے افسانوں میں جس طرح پنجابی اپنی جھلک دکھاتی ہے، بالکل اسی طرح غضنفر اپنے ناولوں میں مطلعِ اردو کو ہندی قوس قزح سے آب دار بناتے ہیں، اس ناول میں انہوں نے ہندو عقیدہ کی جو جھلک دکھائی ہے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوازم پر بھی ان کا مطالعہ ہے، اسی کے ساتھ اس عقیدہ کو ڈرامہ میں جس طرح مسخ کر کے تعصب کی لکیریں کھینچ دی گئیں، وہ بھی اپنے آپ میں ایک بڑا ہنر ہے۔

اس ناول کے مکالمہ میں جو باتیں سمٹ آئی ہیں، وہ واقعی تاریخ کے کئی صفحات

کا نچوڑ ہے، گویا مکالمہ کا بیانیہ اسلوب بھی دل کو چھو جاتا ہے، یعنی مکالمہ ’محادثہ‘ ہے۔
غضنفر ہندوستان میں مسلمانوں کی آمد پر جس طرح کنایۃً گفتگو کرتے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ تاریخ کو ناولوں میں حسین انداز سے سمونے کا ہنر جانتے ہیں، نیز ابتداً ہندوستان آنے والے مسلمانوں سے متعلق تاریخ میں جو گل افشانیاں کی گئی ہیں، انہیں لوٹ مار کرنے اور عورتوں کو لبھا کر الو سیدھا کرنے والا دکھایا گیا ہے، اس خیال کی تردید ایسے نرالے انداز میں کی ہے، جس سے سامنے والے کی زبان خاموش ہو جاتی ہے، گویا یہ ناول اختتام تک پہنچتے پہنچتے ایک تاریخ بھی بیان کر جاتا ہے اور برادرانِ وطن کو یہ پیغام بھی دیتا ہے کہ مسلمان لٹیرے نہیں، بلکہ محب وطن ہیں، ان کے دلوں میں بھی وطن کی خدمت کا جذبہ ہے، خود بٹو کے والد کو ملکی حفاظت کے لئے پیر کا نذرانہ پیش کر کے معذور دکھانا، مسلمانوں کی حب الوطنی کی دلیل ہے۔ ان باتوں کے باوجود برادران وطن کے ایک گروہ کو مسلمانوں کی حب الوطنی مشکوک نظر آتی ہے اور ان کی کامیابیوں پر آپے سے باہر ہو کر وہ سب کچھ کر گزرتے ہیں، جس کی اجازت تہذیب دیتی ہے اور نہ ہی ملکی قوانین ۔ بٹو کے گھرانہ نے پھولوں کے مقابلہ میں جو اول پوزیشن حاصل کی تھی، اس سے تو برادران وطن کو خوش ہونا چاہئے تھا، اس گھرانہ کو مبارکباد دینا چاہئے تھا، مگر برادران وطن نے دنگا کر کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا شروع کر دیا۔

اس ناول میں زبان و بیان ’مانجھی‘ اور ’شوارب‘ کی طرح پرکشش تو نہیں ہے، مگر اس کا پلاٹ موثر ہے، ایسا لگتا ہے کہ ناول نگار ہر واقعہ میں بذات خود موجود تھے اور سلسلہ وار تمام باتوں کو زیر قلم لا رہے تھے۔

تانے بانے کینچلی کے

صاحب کتاب نے ___ کینچلی ___ کے تانے بانے میں معاشرہ کو پرو دیا ہے۔
'کینچلی' ایک ایسا ناول ہے، جس میں پیسے کے پجاریوں کا عکس ہے، جذبات کا سیلِ رواں ہے، مجبوریوں کی انتہا ہے، مسرت کے ترنگ ہیں، عشق و عاشقی کی امنگ ہے، حسن و غربت کے مجسم کا قتل ہے، اپاہج و مفلوج نظام حکومت پر طنز ہے، مشفق دلالوں کا گھن گرج ہے، موقع پرستوں کی عیاریاں بھی ہیں، توہم پرستی پر چوٹ ہے تو مذہبی حد بندیوں کی طرف لطیف اشارہ بھی، درد ہے، کسک ہے، بچوں سے عورت کی بے پناہ محبت ہے، ساتھ ہی بچوں سے مردوں کی دوری والی ذہنیت بھی۔
یہ ناول بھی انتہائی وسیع کینوس پر محیط ہے، تاہم میاں بیوی کے محور پر پوری کہانی گردش کرتی نظر آتی ہے، بینا اور دانش رشتۂ ازدواج سے منسلک ہو گئے تھے، دونوں ایک دوسرے سے مطمئن تھے، خوشیاں دونوں کے رگ و پے میں دوڑ رہی تھیں، دلوں میں شادیانے بج رہے تھے، رنگ و نور میں دونوں ڈوبے ہوئے تھے، پل پل حسین اور دل آویز پر بہار فضا میں وقت گزارنا چاہتے تھے، یہی وجہ تھی کہ کشمیر کی حسین وادیوں سے لذت یابی کے لئے بھی گئے، مگر شاید وہاں قسمت نے یاوری نہیں کی اور دانش پر فالج کا ایسا حملہ ہوا، جس سے وہ تا دمِ زندگی چھٹکارا نہیں پا سکا، پورا جسم شل ہو گیا، رنگ و نور کی پر بہار فضا پر تاریکی چھا گئی، فرحت و انبساط پر پژمردگی کی تہیں جم گئیں،

اس طرح مینا کا سہارا ختم ہو گیا اور خود مینا پر اب ہچکولے کھاتے سفینۂ حیات کو سمندر سے نکالنے کی پوری ذمہ داری آن پڑی۔

اس ناول کا ایک پہلو دھن دولت کا پجاری ہمارا معاشرہ ہے، وہ اس طور پر کہ جب دانش برسر روزگار تھا یعنی سرکاری ملازم، تب وہ سب کی آنکھوں کا تارا تھا، مینا کی سہیلی دیبا کی نظر میں دولہے بھائی عزیز تھے، ان کی ادا دیبا کو پرکشش لگتی تھی، خود مینا کے والد کی نگاہ میں دانش محبوب تھا، اس کا جسم پیارا تھا، مگر کایا پلٹ ہوئی کہ سب بدل گئے، سب کی نگاہوں میں وہ بے وقعت ہو گئے، سہیلی دیبا، والد اور خود اس کے اندرون نے سختی سے دانش کو چھوڑ دینے کا مشورہ دیا، مینا ٹوٹ گئی تھی اور بروقت کوئی فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کیا کرے، والد کو مخلص سمجھے یا دیبا کو، یا پھر خود اپنے اندرون کو ____ :

''مینا! ایک بات کہوں''

''کہو''

''برا تو نہیں مانو گی''

''نہیں''

''مینا! میں جو بات کہنے جا رہی ہوں، بہت ہی نازک اور گمبھیر ہے، کسی حد تک تکلیف دہ بھی، امید کرتی ہوں تم اسے دھیرج سے سنو گی۔ مینا! تم نے اپنا فرض جی جان سے پورا کیا، ہر طرح سے اپنا فرض نبھایا جو کچھ تم سے بن سکا ،کیا۔ کسی طرح کی کوئی کسر تم نے نہیں چھوڑی، اب کسی کی قسمت ہی ایسی ہے تو تم کیا کر سکتی ہو، اب دوسرے کے ساتھ ساتھ اپنا جسم بھی گلانے سے کیا فائدہ؟ تم کب تک اس طرح گونگی، بہری اور بے رونق سی زندگی گزارتی رہو گی ____ ''

''تم کیا کہنا چاہتی ہو دیبا؟'' مینا کی آواز میں ناگواری کی سی کیفیت تھی۔

''یہی کہ تم نئے سرے سے اپنا گھر کیوں نہیں بسا لیتیں ____ ابھی تم کو ہوا ہی کیا ہے؟ جوان ہو، خوبصورت ہو، پڑھی لکھی ہو اور سمجھ دار ہو آسانی سے

تمہیں کوئی اپنا سکتا ہے''۔

دیبا کی باتیں سن کر مینا کے ماتھے پر بل پڑ گئے، اس کی دھنسی ہوئی سیاہ ویران آنکھوں میں شعلے لپلپائے، اس کا چہرہ تمتما اٹھا''۔(صفحہ:21)

''مینا بیٹی! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، کام سے نمٹ کر ذرا دیر کے لئے باہر بیٹھک میں آجانا''

''جی، اچھا''

''دانش کو کھانا کھلا کر مینا بیٹھک میں آگئی۔

''کیا کہہ رہے تھے ابا''

''بیٹی! تم نے اپنی یہ کیا حالت بنا رکھی ہے، اپنے کو سنبھالو، ورنہ ____''

''ابا تقدیر میں یہی سب کچھ لکھا ہے تو میں کیا کر سکتی ہوں؟''

''تم چاہو تو تقدیر بدل سکتی ہے بیٹی! __ سب کچھ ٹھیک ہو سکتا ہے''۔

''میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی ابا''

''بیٹی! میرے خیال سے تمہیں اب نئے سرے سے زندگی شروع کر دینی چاہئے، تم ہاں کہہ دو تو میں تمہارے لئے کوئی مناسب لڑکا دیکھوں''۔

مینا کی آنکھیں ابا کے چہرے کو گھورنے لگیں، اپنی رخصتی کا منظر اسے یاد آنے لگا، کانوں میں ابا کی نصیحت گونجنے لگی۔

''بیٹی تم نے کیا سوچا؟''

''نہیں ابا! نہیں، یہ بڑی ناانصافی ہوگی''(صفحہ 25)

باپ بیٹی اور سہیلی کے مکالمے سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ زندگی اگر کروٹ لیتی ہے تو ایک بیوی کو کیا کیا سہنا پڑتا ہے، کیا کچھ سننا پڑتا ہے۔ باپ بھی اپنی نصیحتوں کو فراموش کر بیٹھتا ہے۔ ان کے مشوروں سے یہ احساس ہوتا ہے کہ شوہر بیوی کا تعلق صرف جنسی تسکین تک ہی محدود ہے، اگر شوہر جنسی خواہشات پوری کر سکے تو بیوی کے

لائق ہے، ورنہ نہیں! اگر شوہر کے پاس دھن دولت کے ذرائع محفوظ ہیں تو وہ شوہر ہے ، ورنہ نہیں! کیا شوہر بیوی کے درمیان انسانیت کا کوئی رشتہ نہیں ہوتا ہے؟ ان مکالموں کے پس منظر میں ناول نگار نے شاید یہی پیغام دینے کی کوشش کی ہے کہ بری حالت میں بھی بیوی کو جیون ساتھی کا کردار نبھانا چاہئے، رفیقۂ حیات کا احساس دلانا چاہئے اور لوگوں کو شوہر سے متنفر کرنے کے بجائے دلاسہ دینا چاہئے۔

ان مکالموں سے ایک اور بات عورت اور مرد کے پس منظر میں ابھر کر سامنے آتی ہے، وہ بایں طور کہ جب شوہر کمزور ہو جاتا ہے تو بیوی کو کوئی مرد ہی نہیں بلکہ عورت بھی شوہر سے کنارہ کشی کا مشورہ دیتی ہے، جیسا کہ دانش کے معاملہ میں مینا کے والد اور دیبا ایک ہی سُر میں دانش سے قطع تعلقی کا مشورہ دے رہے ہیں، اس سے یہ بالکل واضح ہے کہ معاشرہ کے دونوں جنس ایسے غلط مشوروں کے ذمہ دار ہیں۔ والد کے مشورے کے بعد مینا کے دل میں جہاں بہت سے خیالات آئے وہیں امی ابو کا ایک واقعہ بھی یاد آیا:

> ''اماں بہت بیمار تھی، ڈاکٹر نے ایک آدمی کو ہر وقت ان کے پاس رہنے کے لئے کہا تھا، مگر ابا اس حالت میں اماں کو چھوڑ کر اپنے دوستوں کے ساتھ سیر و تفریح میں نکل گئے تھے۔
>
> ابا کی شکل سے ایک عجیب طرح کی کراہیت محسوس ہوئی، اس کی سوچ ابا کے چہرے سے ہٹ کر دانش کی طرف مڑگئی، اس وقت دانش کی جگہ اگر میں ہوتی تو دانش کیا کرتا''۔

اس واقعہ میں کتنا درد اور کسک ہے، وہ تو اپنی جگہ مسلم۔ مگر عورت اور مرد کے تعلق سے جو ذہنی فرق دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، وہ واقعی معاشرہ کا مرض ہے۔ ایک دفعہ ابو بیمار تھے تو بے شمار نوجوان خوبصورت نرسوں کی تسلیوں سے انہیں تشفی نہیں ہو پائی تھی ، ان کا اندرون امی کی طرف ہی مائل تھا، مگر ایک دفعہ امی بیمار ہوئی، ان کا اندرون بھی

ابو کی طرف ہی مائل تھا، مزید ڈاکٹروں کا مشورہ بھی تھا، مگر ابو ان باتوں کے باوجود بھی دوستوں کے ساتھ سیر وتفریح میں نکل گئے۔

دیبا اور اس کے شوہر کے ساتھ مینا ایک بار فلم دیکھنے گئی، فلمی مناظر ہیجان انگیز تھے ،ایک منظر تو کچھ یوں تھا کہ شوہر سے دور بیوی ہمیشہ شوہر کو یاد کرتی ہے، یہاں تک کہ اسی کی تصویر چوم چوم کر کہتی ہے کہ آپ کب آئیں گے ،مگر دوسرے منظر میں وہی شوہر دوسری عورت سے رسم وراہ کر کے دل بہلاتا ہے، وہ عورت (جس سے شوہر ناجائز طریقے سے لطف اندوز ہو رہا ہے) پوچھتی ہے کہ کیا آپ جس طرح غیر عورت سے جنسی بھوک مٹانے کی کوشش کرتے ہیں، اسی طرح آپ کی بیوی بھی کرتی ہے یعنی کوئی بوائے فرینڈ رکھتی ہے، تو اتنے میں شوہر کے دماغ میں غصہ کی لہر دوڑ جاتی ہے، ناول نگار یہ دکھانے کی کوشش کر رہا ہے کہ مرد/شوہر کس قدر بے وفا ہے اور عورت/بیوی کس قدر امانتدار۔

ناول نگار نے اس فلم سے مرد وعورت کا صرف کردار ہی واضح نہیں کیا ہے، بلکہ ساتھ ہی ساتھ موجودہ فلموں میں پائی جانے والی فحش حرکتوں پر بھی چوٹ کی ہے، فلم کا دوسرا منظر کچھ ایسا تھا کہ دیبا اور اس کے شوہر کی موجودگی میں مینا ٹھہرنا گوارہ نہیں کر پا رہی تھی، یہی وجہ تھی کہ وہ اپنی چھوٹی انگلی دکھاتے ہوئے بہانہ بنا کر چند منٹوں کے لئے ان دونوں کے پاس سے چلی گئی۔

> ”فلم کا منظر فلم بینوں پر اپنا اثر مرتب کرنے لگا تھا، لوگ پہلو بدلنے لگے تھے، انگلیوں کا رقص شروع ہو گیا تھا، پیروں کے دباؤ میں تیزی آ گئی تھی، جسموں میں کسمساہٹیں پیدا ہونے لگی تھیں، راشد کی انگلیاں بھی دیبا کے شانے پر آ گئی تھیں اور ہولے ہولے رقص کر رہی تھیں، دیبا کے اندر بھی جذبات ہچکولے کھا رہے تھے، لیکن وہ مینا کی موجودگی کے سبب اپنے جذبے کا اظہار کرنے سے ہچکچا رہی تھی“۔

اس فلم کے مناظر کو ابھارنے میں دراصل ناول نگار کا یہ مقصد ہے کہ بینا کو دیبا شوہر بیوی کی موجودگی میں یہ فلم دیکھنا گوارہ نہیں ہو پار ہا تھا تو ماں بیٹے، باپ بیٹی یا دیگر قریبی رشتہ دار آج کی فلم کیسے ایک ساتھ بیٹھ کر دیکھ لیتے ہیں۔

''کینچلی'' میں بھرے جذبات کا احساس اس وقت ہوتا ہے، جب بینا، دیبا، والد اور اپنے اندرون کے کہنے پر دانش کو چھوڑ کر بھاگ جانے کا فیصلہ کر لیتی ہے، بلکہ بس نکل ہی جاتی ہے، تاہم جاتے جاتے دانش کے کمرے سے نکلنے والی آواز پر رک جاتی ہے۔

یہاں پر یہ واضح ہو گیا کہ با حوصلہ عورت بھی منٹوں میں جذبات کی رو میں بہہ کر کچھ بھی کر سکتی ہے، پہلے گھر سے بھاگنے کا ارادہ تھا کہ منٹوں میں نہ جانے کا مصمم فیصلہ کر لیا۔

اس ناول کے مزید دردناک پہلو اس وقت سامنے آتے ہیں جب بینا دانش کے ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لیتی ہے، گھریلو ذمہ داریاں اپنے کندھوں پر لے کر وہ بادل نخواستہ کسی آفس میں نوکری کر لیتی ہے، دیبا کا دیور کسی طرح اپنے آفس میں بینا کو ملازمت پر لگا دیتا ہے، بینا پری پیکر تھی ہی اور غربت کی ماری بھی، کہتے ہیں نا کہ خوبصورت غریب لڑکی معاشرہ کے لئے نرم چارہ ہوتی ہے، بالکل یہی معاملہ آفس میں نظر آنے لگا کہ ہر شخص رحم وشفقت کے پردہ سے اس کے حسن کا دیدار کرنے لگا تھا، محلّہ کے افراد کی ترچھی نگاہوں سے بھی وہ چھلنی ہونے لگی تھی۔

ایک دن آفس سے لوٹتے ہوئے بجن بینا سے یوں مخاطب ہوتا ہے:

''بینا بھابھی''

''جی''

''میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا تھا''

''کہیے''

''بھابھی بتا رہی تھیں کہ آپ کالج کے زمانہ میں اپنی شوخی،

بے باکی اور آزاد خیالی کے لئے کافی مشہور تھیں، اور فیشن بھی خوب کرتی تھیں
''(صفحہ:39)

اس مکالمہ میں غریب خوبصورت عورت / لڑکی کو نرم چارہ سمجھنے کا عملی مظاہرہ شروع ہو چکا ہے، سجن بخوبی واقف تھا کہ ایک عورت مرد کے بغیر نہیں رہ سکتی ہے، چنانچہ اس نے اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کر دیا اور موقع کی تلاش میں تھا، میلا دکھانے کے بہانے بھول بھلیاں لے گیا اور وہیں رفتہ رفتہ دونوں کی دوریاں مٹ گئیں، تمام فاصلے ختم ہو گئے، دوئی ختم ہو گئی۔

عمل کا ردعمل جب سامنے آیا تو دانش بھی مینا کی غلط حرکت سے آگاہ ہو گیا، وہ دم بخود رہ گیا، مینا کو بھی احساس ہو گیا کہ جیسے اس نے کوئی نا قابل معافی غلطی کر لی ہو۔

اس واقعہ کے بعد اس ناول کے کردار معاشرتی اعتبار سے اور بھی دلچسپ ہو جاتے ہیں، اولاً سپر نٹنڈنگ انجینئر کا کردار بھی معاشرہ اور سرکاری محکمات کے پس منظر میں دل دہلانے والا ہے، کیونکہ مینا کا حق تھا کہ شوہر کی بیماری کے بعد اسے نوکری ملے، مگر مفلوج نظامِ حکومت کی دین تھی کہ نوکری پانے کے لئے مینا کو عزت کا سودہ کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔

اس ضمن میں مینا اور دیبا کا مکالمہ درد سے بھرا ہے، اس میں عورتوں کے جذبات ہیں اور بے بسی بھی۔

''صاف بتاؤ نا کیا ہوا''

''دفتر میں تو اس نے صاف منع کر دیا کہ کوئی جگہ خالی نہیں ہے، جب میں نے بہت منت وسماجت کی اور کہا کہ میں چپراسی کی جگہ پر بھی کام کرنے کے لئے تیار ہوں تو بولا کہ شام کو گھر آجانا، میں چیف انجینئر صاحب سے کہہ کر تمہیں کسی ڈویژن میں رکھوادوں گا، جب میں گھر پہونچی تو

حرامی انتہائی بے شرمی سے بولا کہ نوکری حاصل کرنی ہے تو آج رات میرے پاس رہ جاؤ!''

''اس نے یہ کہا! اس سور کا منہ کیوں نہیں نوچ لیا''

''منہ کیا نوچتی، ہاں دھمکی ضرور دی کہ اس کی شکایت اوپر والوں کو کروں گی، لیکن میری دھمکی کا اس پر یہ اثر ا ہوا کہ اس کے منہ میں قہقہہ پھوٹ پڑا، جانتی ہو، قہقہہ لگاتے ہوئے کیا بولا ___ بولا جہاں بھی جاؤ گی، یہی مطالبہ ہوگا، شکایت سننے کے لئے بھی یہی شرط رکھی جائے گی''

''پھر کیا ہوا''

''ہوتا کیا؟ میں اسے اور اپنی تقدیر دونوں کو کوستی ہوئی واپس آ گئی''

''شکایت نہیں کی اس کی''

''کیا کرتی ___ اس کا قہقہہ اتنا جاندار تھا کہ آگے جانے کی ہمت نہ ہو سکی'' (صفحہ :35-34)

اس مکالمہ میں درد ہے، اس میں مفلوج نظامِ حکومت پر چوٹ ہے اور سرکاری محکمات کی ذہنیت پر افسوس کہ حقدار کو بھی حق لینے میں عزت کا سودا کرنے پر مجبور کیا جار ہا ہے۔

اس جگہ ایک اور نکتہ دل کو اپنی طرف متوجہ کرتا ہے کہ غضنفر نے خود اپنے ناول ''مانجھی'' میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عورتوں کو خواہ کتنا ہی گھٹیا کام کیوں نہ سونپ دیا جائے، وہ بخوشی کرتی ہیں، کبھی کوئی اعتراض نہیں کرتیں، اگر کہیں کہیں وہ کچھ اعتراض کرے تو بہت سی بلاؤں سے وہ محفوظ رہ سکتی ہیں، بالکل یہی صورتحال یہاں بھی ہے کہ اگر مینا انجینئر کی بات مان لیتی تو شاید اسے نوکری مل جاتی، مگر اس کی عفت لٹ جاتی، یہاں مینا قانونی اعتبار سے بہت کچھ نہ کر سکی، مگر اس کی عزت محفوظ رہی،

واقعی اگر عورت ٹھان لے تو بہت کچھ ہو سکتا ہے، نہ جانے کتنی عزتیں محفوظ رہ سکتی ہیں۔

انجینئر والا یہ کردار تو انتہائی افسوسناک ہے، مگر بجن کا جو کردار ہے، اس پر فی الفور کوئی فیصلہ سنانا انتہائی محال ہے، کیونکہ اک طرف بجن نے ہی مینا کو نوکری دلوائی، آفس کی بے شمار بری نظروں سے بچانے کی کوشش کی، یہی وجہ تھی کہ دانش کے گھرانہ پر سے ضروریات زندگی کے بادل چھٹ گئے، مگر دوسری طرف اس نے غلط حرکت کی اور ایک عورت کی عصمت کو تار تار کیا، اس کے علاوہ مینا کا جسم بھی تپا تھا، جنسی خواہشات کی لپٹوں سے وہ جھلس رہی تھی، آخر ایسے میں بجن کے کردار کو افسوسناک کہا جائے یا مینا کے کردار کو؟ اسی کے ساتھ بجن یہ بھی چاہتا تھا کہ حمل کسی طرح ضائع ہو جائے، تاکہ معاشرہ میں مینا کو شرمندگی نہ اٹھانا پڑے، مزید بجن نے یہ بھی کہا کہ اگر کوئی مسئلہ ہو تو میں تم سے شادی کے لئے بھی تیار ہوں۔

عجب کشمکش کے بعد یہ فیصلہ کرتے ہوئے کوئی جھجک نہیں کہ دونوں کا کردار شرمناک نہیں ہے، شرمناک تو معاشرہ کا کردار ہے، کیونکہ معاشرہ کو کوئی ایسی صورت نکالنی چاہئے تھی کہ کوئی مرد اگر مینا کی خوبصورتی کی طرف مائل ہے اور اس سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اسے مینا کے ساتھ ساتھ دانش کو بھی قبول کرنا چاہئے، مینا کے والد اور خود اس کی سہیلی کو بھی کوئی ایسا درمیانی راستہ نکالنا چاہئے تھا کہ مینا کے ساتھ ساتھ دانش بھی جائے، مینا جس کے پاس جائے وہی دراصل مینا کا شوہر رہے، دانش اب بھی شوہر نہیں تھا، کسی اور سے مینا کی شادی ہوتی تب بھی وہ اس کا شوہر نہیں ہوتا، مینا تو صرف انسانیت کے ناطے 'جیون ساتھی' کے اعتبار سے دانش کی خدمت کرتی۔

ناول نگار نے بھی خود دانش کی زبان سے یہ واضح کروایا کہ وہ اپنے اور مینا کے درمیان کے موجودہ رشتہ کو کون سا نام دے۔

"یہ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس رشتہ کو کیا نام دوں؟ مگر

ہاں! یہ ضرور سمجھ میں آ گیا ہے کہ یہ رشتہ سب سے الگ ہے، جدا ہے، اوپر ہے، مینا کے مسلسل کشاکش اور تصادم کا کرب جھیلنے کے بعد آج میں جان گیا ہوں کہ ہم مہذب سماج، فلسفہ، قانون سب کی گرفت سے باہر ہیں، آج میں یہ بھی جان گیا ہوں کہ تمہارا دکھ کیا ہے، ٹھیک اس طرح جس طرح تم نے میرا دکھ جانا'' (صفحہ:111)

اس ناول کے چند کردار ایسے ہیں، جن کے تعلق سے خاموش رہنا بھی اچھا نہیں لگتا اور نہ ہی کچھ زیادہ بولنا بھی۔

مینا چاہے کچھ بھی ہو، مگر ایک وفادار رفیقہ حیات ہے، دلنواز معشوق ہے، سچے پیار کی مجسم تصویر ہے، عشق وشوریدگی میں بہہ جانے والوں کے لئے آئیڈیل ہے، اور تو اور ''جوانمرد'' ہے، گوشت پوشت کی عورت نہیں شاید فولاد ہے۔

دانش بھی سچا عاشق کہ اس گئے گزرے حالات میں بھی مینا کی دلجوئی کی چیز خرید کر دیتا ہے اور اس کی صحت کے لئے دوا بھی، وہ بھی اس حالت میں بازار گیا کہ اسے نہیں جانا چاہئے تھا۔

غضنفر نے اس ناول میں ایک ایسا لطیف اشارہ بھی کیا ہے، جس پر خاموش رہنا بھی بہتر نہیں ہے اور نہ ہی زیادہ گفتگو کرنا بھی، انہوں نے مذہبی مسئلہ کو سامنے رکھ کر کہ بھوک مٹانے کے لئے اضطرار کی حالت میں ناجائز چیزیں بھی جائز ہو جاتی ہیں تو اضطرار کی صورت میں جنسی بھوک مٹانا کیسے ناجائز ہی رہتا ہے، یہاں بھی تو مشکل صورت ہے، کیوں کہ اگر جائز طریقے سے مینا جنسی بھوک مٹاتی یعنی دوسری شادی کر لیتی تو دانش کی دیکھ بھال کون کرتا، اب جب کہ اس نے سجن سے جو بھوک مٹائی اسے کیسے ناجائز قرار دیا جا سکتا ہے، چنانچہ انہوں نے مذہبی لیڈران سے غور وفکر کی اپیل کی ہے کہ ایسے نازک موڑ پر کیا کیا جائے، کیا حرام ہوگا اور کیا حلال؟

غضنفر نے اپنی تمام تر خصوصیتیں اس ناول میں بھی برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے، مگر ان کی ہندی زدہ اردو اس میں نظر نہیں آتی ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو سکتی ہے کہ دیگر

ناولوں میں کردار ہندو تھے اور کینچلی میں مسلم ہیں۔

اسی کے ساتھ غضنفر نے کردار کے لئے شاید مینا، دیبا اور بجن کے ناموں کا انتخاب دانستہ کیا ہو، اس سے انہوں نے یہ پیغام دینے کی کوشش کی ہو کہ مسلم معاشرہ میں اب غلط سلط نام رکھنے کی جو روش چل پڑی ہے، وہ غلط ہے۔

کردار کے علاوہ ناول کی منظر نگاری بھی دلآویز ہے:

> ''دیبا کا گھر رنگ ونور میں ڈوبا تھا، چاروں طرف گہما گہمی تھی، محفل کے وسط میں دیبا اپنے شریک سفر کے ہمراہ رعونت کے ساتھ بیٹھی تھی، سرخ جوڑے اور طلائی زیورات میں وہ بالکل نئی نویلی دلہن لگ رہی تھی، جسم کی سج دھج ،آراستہ انگوں کا جوبن، آنکھوں کی مستی، چتونوں کی بانکپن، چہرے کی چمک، رخساروں کی دمک، ہونٹوں کی رسیلی رنگت، ایک ایک بناؤ، ایک ایک بھاؤ، ایک ایک سنگار، ایک ایک نقش، ایک ایک رنگ، محفل کی ایک ایک نگاہ کو اپنی طرف متوجہ کر رہا تھا'' (صفحہ:53)

اس ناول میں مکالمے بھی کردار کے اعتبار سے انتہائی موزوں ہے، پلاٹ بھی دلچسپ، مگر دانش کی ذاتی زندگی یعنی والدین، بھائی بہن اور دیگر رشتہ داروں کے اعتبار سے اجاگر کی جاتی تو اچھا تھا، کیونکہ یہ سمجھنے میں آسانی ہوتی کہ اگر مینا دانش کو چھوڑ دیتی تو کس کے پاس اس کا گزارا ہوسکتا تھا، کون سے قریبی رشتہ دار اسے اپناتے یا اپنانے کا امکان واضح ہوتا، اس طرح مینا اور بجن کا کردار بھی متعین کرنے میں مدد ملتی۔

کہانیوں کا سمندر

ناول نگار نے ___ کہانی انکل ___ کے پیکروں میں تاریخ اور حالات حاضرہ کی پیکر تراشی کی ہے۔

غضنفر کے دگر نالوں سے ناول ''کہانی انکل'' مختلف وممتاز ہے۔ اس میں علامتی رنگ سے نقش ونگار کا کام لیا گیا ہے، تاہم موضوعاتی اعتبار سے اس ناول کی بھی وہی اہمیت ہے جو غضنفر کے دیگر ناولوں کی ہے، انہوں نے جنگلی جانوروں کے پردے میں جو باتیں کی ہیں، وہ تاریخ ہے، عہد حاضر میں عصبیت کی سلگتی آگ ہے، مسیحا کی خود غرضی ہے، آزادی کی جدو جہد کی جھلک ہے، کمزور اور طاقتور ممالک کے تئیں اقوام متحدہ کے رویہ کی جھلک ہے، توہم پرستی اور ڈھکو سلے باز مذہبی پیر وفقیر کی نقاب کشائی ہے، ثقیل اور ادق لکھنے والوں پر طنز ہے، حیرت واستعجاب کی انتہائی ہے، غریبوں پر حکومت کی ترچھی نگاہ ہے اور کم وقت میں بہت کچھ پالینے کی ہوس بھی۔

کہانی انکل ___ پر کچھ لکھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے ہر پیکر پر الگ الگ گفتگو کی جائے، اس میں بارہ پیکر ہیں، اگر دیکھا جائے تو یہ بارہ اپنی اپنی جگہ ایک اکائی ہے، ایک افسانہ، ایک کہانی ہے۔

پہلا پیکر ___ **کہانی کا دھندا**

اسی پیکر میں وہ کہانی انکل سامنے آگئے، جن کے نام سے پورا ناول موسوم ہے اور

یہی انکل ناول کا مرکزی کردار بھی ہیں۔

اس کہانی میں بھی تیکھا درد ہے کہ اگر ہندوستان میں کوئی مسلمان اقبال وعروج کے منازل طے کرتا ہے تو ہر طرف اس کے خلاف سازش رچی جاتی ہے، ہر طریقہ سے اس کے حوصلے اور جذبے کو سرد کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، ناول نگار نے یہی دکھایا کہ کہانی انکل بینک سے لئے لون سے جس طرح ہوٹل چلا رہے تھے، اگر چلاتے رہتے تو کوئی پریشانی نہیں آتی، مگر فرقہ پرستوں نے اس ہوٹل کو بند کروانے کے لئے سازش رچ کر 'مٹن میں بیف کی ملاوٹ ہوتی ہے' ایک مسلمان کا بنا بنایا کام ناکام کردیا۔ اس کے بعد انہوں نے کتاب کی دکان کھولی تو آگ کی نذر ہوگئی، جب کپڑے کی دکان کھولی تو بڑے بیوپاریوں نے کپڑا اتنا سستا کردیا کہ بیچارے کہانی انکل کی دکان ٹھپ پڑ گئی، اس واقعہ میں یہ ذہنیت بھی نظر آتی ہے کہ مسلمانوں کو نیچا دکھانے اور انہیں مارکیٹ سے اکھاڑ پھینکنے کے لئے لوگ اپنا نقصان بھی سہہ لیتے ہیں، جیسا کہ بڑے بیوپاریوں نے کیا، ان میدانوں میں ناکامی کے بعد کہانی انکل نے پھیری شروع کردی کہ روزی روٹی چل سکے، مگر فرقہ پرستوں نے ایسی چال چلی کہ ان پر جاسوس ہونے کا الزام عائد کردیا۔

اس سے بالکل عیاں ہے کہ مسلمانوں کو کس طرح کمزور و لاغر کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، فرقہ پرست عناصر چاہتے ہیں کہ مسلمان اچھا کھائے پئے نہیں، ساتھ ہی ساتھ حکومت بھی ایسی روش اختیار کرتی ہے کہ فی الفور جاسوسی کا الزام عائد کرکے دھر پکڑتی ہے۔

اس پیکر کا ایک اور پہلو دردناک ہے، وہ اس طرح کہ معاشرہ سے اچھے برے کی تمیز ختم ہوگئی ہے، بڑے سے بڑا گناہ بھی اب کوئی تعجب کی بات نہیں رہ گئی ہے۔

''بن بیاہی عورت ماں بن گئی، 'جرم ثابت ہوجانے کے باوجود مجرم بری ہوگیا'

'قاتل کو انعام سے نواز گیا'

'کوئی اور دکھاؤ'

'گلابوں پر گیندے کھلے'

'کوئی اور'

'شاخ سے ثمر ٹوٹا زمین پر نہیں گرا'

'اور'

'پانی میں آگ لگ گئی، سائبانوں سے دھوپ برستی ہے، آسمان زمین پر اتر آیا،
زمین آسمان پر پہنچ گئی'

'کوئی اور'

عجب ہے آپ، اور اور کی رٹ لگائے جا رہے ہیں، مگر ایک بھی حیرت پر آپ کی آنکھ نہیں پھیلی، پیشانی پر کوئی لکیر نہیں ابھری، کیا یہ حیرتیں آپ کو حیرت انگیز نہیں لگیں؟۔

'حیرتیں، حیرت انگیز نہیں، مجھے تو نہیں لگیں'۔" (صفحہ: 11,12)

بات دراصل یہ تھی کہ ایک ادارۂ حیرت کو حیرت میں ڈالنے دینے والی چیزوں کی ضرورت تھی، اس نے ایسی چیز لانے والوں کے لئے منہ مانگے انعام کا اعلان بھی کیا تھا، کہانی انکل بھی معاشرہ کی بے شمار بری باتوں کو یہ سوچتے ہوئے لے کر پہنچے کہ واقعی یہ حیرت کی باتیں ہیں، مگر ان کی فہرست کی کوئی بات حیرت میں ڈالنے والی نہیں نکلی، اس کے باوجود بھی انکل مایوس نہیں ہوئے، حیرت کی تلاش میں لگے رہے، مگر اب کہانی انکل کو بھی باپ بیٹی کا زنا، بیٹے کا ماں کے اوپر سوار ہونا، رہبروں کی رہزنی، لنگڑوں کا دوڑنا، زہر کا بے اثر ہونا اور اس طرح کے بے شمار حیرت میں ڈالنے دینے واقعات حیرتناک نہ لگے، ایک دن کہانی انکل نے تلاش و جستجو کے بعد ادارہ حیرت میں یہ پیش کر دیا "کسی کی قابلیت اس کے کام آگئی"۔

اگر انصاف پسندی کے نظریہ سے دیکھا جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ

کسی قابل کو اس کی قابلیت کام آجائے ، ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرہ کا آج سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ حق دار کو حق مل جائے ، کیونکہ عدل وانصاف کا جنازہ نکل چکا ہے، عدل گستری کو گہن لگ گیا ہے، ایسے میں کسی قابل کو اس کی قابلیت کام آگئی ، یہ حیرت کی بات ہے، گویا یہ احساس ہوا کہ انصاف کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں انصاف کا ٹمٹماتا دیا کسی نہ کسی طرح روشن ہے، مگر جب قابل شخص کو حق دینے والے سے پوچھا گیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اس قابل شخص کو نوکری اس کی قابلیت کی بنیاد پر نہیں ملی ہے، بلکہ ہم نے اپنی زبان کا مزہ بدلنے کے لئے ایسا کیا ہے، یعنی اس کی قابلیت کام نہیں آئی ہے، یہاں بالکل واضح ہو گیا کہ بڑے سے بڑا جرم بھی حیرت کی بات نہیں ہے، بلکہ اب حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی قابل کو اس کی قابلیت کام دے جائے، کسی حقدار کو حق مل جائے، یہ ہے ہمارے معاشرہ کا سچ۔

اس کہانی کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول نگار نے انشائیہ کا اسلوب اپنایا ہے تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

ان تمام باتوں کے بعد کہانی انکل نے کہانی سنا سنا کر پیسہ کمانے کا من بنایا، اس لئے کہ اس میں بآسانی کچھ لگائے بغیر بہت کچھ کمایا جا سکتا تھا، گویا یہاں تساہل پسندی بلکہ تاجرانہ ذہن ہے کہ کچھ لگاؤ اور بہت کچھ پاؤ، چنانچہ ان کا ذہن کہانی کی تلاش میں لگا، مگر کہانی کہیں نظر نہیں آئی:

> ''اس نے اپنی لکھی ہوئی کہانیوں پر نظر دوڑائی تو وہاں بھی کوئی کہانی دکھائی نہ دی ، وہ ساری کہانیاں پڑھے لکھے لوگوں کے لئے لکھی گئی تھیں، جن کی باتیں گاڑھی ، پیچیدہ اور فلسفیانہ اور زبانیں ادق علمی اور مفکرانہ تھیں۔
>
> اب اسے اندازہ ہوا کہ کہانی سنانے کا یہ دھندا، اتنا آسان نہیں جتنا کہ اس نے سوچ لیا تھا، مگر اس کے لئے کہانی اتنا مشکل بھی نہیں تھا کہ وہ ہمت ہار جاتا۔

اس نے اسے ایک چیلنج کے طور پر قبول کیا اور اسے عملی روپ دینے میں وہ دل وجان سے جٹ گیا" (صفحہ:21)

یہاں گویا ناول میں ادق، ثقیل اور فلسفیانہ کہانیوں پر طنز ہے کہ اب کہانیاں عام فہم نہیں ہو کر مخصوص طبقہ کے لئے ہوتی جارہی ہیں، یہاں دوسری بات یہ بھی ہے کہ ہرا یک کے اندر بہت کچھ کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے، اگر کہانی انکل اسے چیلنج کے طور پر نہیں لیتے اور یہیں سرد پڑ جاتے کہ کہانی لکھنا اور سنانا بہت مشکل ہے تو شاید بھوکوں مرتے۔

دوسرا پیکر___**باھر کی بھیڑیں**___:

کہانی انکل اب برابر محلہ کے بچوں کو کہانی سنانے لگے تھے، بچے لطف اندوز ہوتے تھے اور انہیں بھی کچھ مل جاتا تھا۔

اس پیکر کی کہانی بھی علامتی ہے۔ جنگل، ملک کی علامت ہے، بھیڑیں مسلمان ہیں ،شیر سے مراد حکومت ہے، سفید بھیڑیں جو شیر کو محبوب ہے، دراصل مسلمانوں کے مسلم نمائندے ہیں، یا یوں کہئے حکومت کے چہیتے بیٹے یا مسلمانوں کی آستین کے سانپ۔

کہانی میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، مسلمان نمبر دو کے شہری ہیں، باہری ہیں ،اس لئے جنگل کے بادشاہ یعنی حکومت کی نگاہ میں مبغوض ہے، مگر چند بھیڑیوں سے حکومت خوش ہے۔

زمانہ انتخابات میں مسلم بھیڑ کس قدر شیر کے لئے محبوب ہو جاتے ہیں، اگر کوئی مسلمانوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو بہ ظاہر شیر تلملا جاتا ہے اور بھیڑیوں سے کہتا ہے کہ ہم تمہارے ہیں، تمہاری حفاظت کی پوری ذمہ داری میری ہے، گویا ان کی گیدر بھبھکی یا دلنواز وعدوں میں مسلم / بھیڑیں ووٹ دے دیتے ہیں، گویا پوری کہانی ہندوستانی سیاست اور مسلمانوں کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔

تیسرا پیکر___**تھپے والا سانڈ**

اس میں بھی علامتی کہانی ہے۔ سانڈ علامت ہے لفنگے، اوباش، چورا چکوں کی۔ کانجی ہاؤس علامت ہے جیل کی۔

یہ سانڈ بہ ظاہر ہندو بستی سورج پور سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے مسلم محلے میں آکر ادھم مچاتے تھے، غریبوں کو ستاتے تھے، مسلم لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، گاؤں کے افراد کو پریشان کرتے تھے، باشندگان محلہ نے کانجی ہاؤس میں شکایت کی، مگر ان کی شکایت مسترد کردی گئی۔

بڑے تھانہ میں بھی شکایت ہوئی، مگر کچھ بھی نہیں ہوا، پھر ردعمل کے طور پر مسلمانوں نے بھی سانڈ تیار کرکے چھٹا چھوڑ دیا کہ وہ ہندو محلہ میں جاکر نقصان پہنچائے، مگر مسلم سانڈ ہندو سانڈ کے ساتھ مل گئے ان کے ساتھ ساتھ جاکر غلط سلط حرکتیں کرنے لگے۔

اس کہانی کے پس پردہ کئی ایک کہانیاں ہیں، اولاً تھانہ اور چوکیوں پر طنز ہے، کیونکہ وہاں مسلمانوں کی رپورٹ تک درج نہیں کی جاتی ہے، ہر جگہ ان کے معاملے کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر تھانوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ تھانے میں گھس کر دیکھنے کے بعد محلّہ کے مسلمانوں کو بھی اندازہ ہوا تھا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو سانڈ ہوتے ہیں، وہ بہ ظاہر ہندو یا مسلم نظر آتے ہیں، مگر ان کا تعلق حکومتی افراد سے ہوتا ہے، اس لئے چوکی والے ایسے سانڈ کی ایف آئی درج کرنے سے کتراتے ہیں، کیونکہ ان کے خلاف شکایت درج کرنے میں نوکری سے ہاتھ دھونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے اور کوئی منافع بھی نہیں۔ سانڈ دراصل حکومت کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور حکومت ان کے پس پردہ لوگوں سے ہمدردیاں بٹورتی ہے، مسلمانوں نے جو سانڈ تیار کئے تھے وہ بھی ہندو سانڈ کے ساتھ مل کر حکومت کے لئے کام کرنے لگے تھے، گویا اس میں یہ سبق ہے کہ ہندو۔ مسلم انجان

ہوتے ہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کوکوستے ہیں، اس طرح فرقہ وارانہ فسادات دہک اٹھتے ہیں، مذہب اور ذات کے نام پر خون کی ہولی کھیلی جاتی ہے، مگر مسلمانوں کا قصور ہوتا ہے اور نہ ہی ہندوؤں کا، بلکہ سراسر بالواسطہ حکومت قصوروار ہوتی ہے، وہی ان فسادات کے لئے ذمہ دار ہوتی ہے، کیونکہ ٹھپے لگے سانڈوں کووہی پالتی ہے۔

چوتھا پیکر ____ **گدھوں کے سینگ**

یہ بھی ایک علامتی کہانی ہے، اس میں گدھا علامت ہے ممبئی میں کام کرنے والے ملازم پیشہ افراد کی، رشی علامت ہے ممبئی کوملکیت تصور کر لینے والوں کی۔ڈاکٹر سے مراد کوئی طاقت ور یوپی-بہار کا باشندہ ہے۔

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ممبئی کو اپنی ملکیت سمجھنے والے افراد ملازم پیشہ افراد کو جانور سمجھ بیٹھے تھے، یعنی گدھا۔ وہ ان سے ایسے ایسے کام لیتے ہیں، جن سے دل کانپ اٹھے، جسم لرز جائے، مزدوران کی حرکتوں سے بہت پریشان تھے، اسی زمانہ میں کوئی ڈاکٹر (کوئی بہاری یایوپی کاباشندہ) نمودار ہوااوران مزدوروں سے مخاطب ہوکر کہتا ہے کہ تم سینگ نہ ہونے کی وجہ سے پریشان ہو، آؤ میں تمہارے سروں پر سینگ اگادوں، اس کے عوض میں تم سے کوئی ذاتی فائدہ حاصل نہیں کروں گا، صرف میری دوا ادھر سے ادھر کر دینا، جو کہ تمہارے جیسے لوگوں کے لئے ہے۔

گدھے تیار ہو گئے، سینگ ان کے سروں پر نکل آئی، یعنی زبان چلانے کا طریقہ سکھایا گیا، اب وہ دوسروں کو سینگ مارنے لگے، یعنی مالکان کو بھی آنکھ دکھانے لگے، اپنی برتری ثابت کرنے لگے، چنانچہ وہ ان گدھوں سے ناراض ہو گئے، بیچارے گدھوں کا اب صرف سہارا ڈاکٹر ہی بچا، ڈاکٹر اب ان سے ایسے ایسے کام لینے لگے، جو ممبئی والوں سے بھی زیادہ سخت تھے، وہ اب حیران تھے، پریشان تھے، انہوں نے ڈاکٹر سے کہا کہ ہمارے سینگ توڑ دو، ڈاکٹر نے کہا کہ یہ کام مجھ سے نہیں ہو پائے گا

،اتفاقاً ایک دن گدھوں کی ملاقات رشی کے خاندان کے افراد سے ہوگئی، وہ کہتا ہے کہ ڈاکٹر نے کیا دیا تمہیں، تم نے سینگ لگوا کر خود اپنا ہی نقصان کیا، اب بھی وقت ہے کہ تم سینگ توڑ کر ہمارے ساتھ ہو جاؤ۔

یہ تو واضح ہے کہ ممبئی والے باہر کے لوگوں کو خوب پریشان کرتے ہیں، مگر اپنے بھی جا کر ان کا بھلا نہیں کرتے ہیں، بلکہ وہ ممبئی والوں سے بھی زیادہ ان مزدوروں کو درد دیتے ہیں، ان کا استحصال کرتے ہیں، مگر ان حالات نے ان مزدوروں کو بہت سکھایا، چنانچہ وہ یہاں کے بجائے کہیں اور مزدوری کے لئے چلے گئے، ان کے جانے کے بعد شیو سینک اور ڈاکٹر کے کاروبار ٹھپ پڑنے لگے۔

پانچواں پیکر ___ فقیری سنگ ریزہ

اس پیکر میں میرے حساب سے نصیحت ہے کہ کھیل تماشہ دکھانے والوں کے چکر میں آکر وقت نہ برباد کیا جائے، کیونکہ وہ فضولیات میں پھنسا کر ہمیشہ اپنا الو سیدھا کرنا جانتے ہیں، اسی طرح توہم پرستی پر بھی طنز ہے۔

چھٹا پیکر ___ کوا اور کلہاڑی

اس میں دراصل آزادیٔ ہند کا تذکرہ ہے، اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانیوں نے ملک کو سینچا تھا، یعنی کھیتی کی تھی، مگر چتر چالاک انگریزوں نے اس پر قبضہ کرلیا، جب باشندگان ہند نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی حکمت عملی شروع کی تو ایک وقت ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان آزاد ہو گیا، یہاں پر 1857 کی جانب اشارہ ہے، یہ محض خام خیالی تھی کہ ملک آزاد ہو گیا، مگر انتہائی جانفشانی کے بعد 1947 میں ملک آزاد ہوا، سب نے سکون کی سانس لی، اس آزادی کے بعد کچھ یوں ہوا کہ برادران وطن کی نگاہ میں آہستہ آہستہ مسلمان مبغوض ہو گئے۔

ساتواں پیکر ___ سپیرا اور سانپ

اس میں یہ واضح کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ جب کوئی آدمی یا ملک ڈھلمل یقین ہوجاتا ہے تو کوئی بھی بآسانی ٹھگ کر نکل جاتا ہے، جیسا کہ سپیرا آکر گاؤں کے لوگوں کو ٹھگتا تھا، مگر جب اس گاؤں کے ایک لڑکے نے ذرا ہمت دکھائی اور لوگوں کو حوصلہ دیا تو سپیرے کی چالبازی سے باشندگان محلہ محفوظ ہوگئے۔

یہاں یہ بھی ایک نکتہ ہے کہ ایک نوجوان پورے محلہ کو سپیرے کی چالبازی سے بچا سکتا ہے اگر خدا کی دی ہوئی عقل کا استعمال سب کرنے لگ جائیں تو بڑی بڑی مصیبتوں سے چھٹکارا پایا جا سکتا ہے۔

آٹھواں باب ___ **کھانی کمیشن**

اس باب میں دو باتیں ہیں، اولاً مسلمانوں کے تئیں حکومت کا جانبدارانہ رویہ کہ وہ فرقہ پرستوں کی شہہ پر ایک معمولی کہانی سنانے والے پر بھی کمیشن بٹھا دیتی ہے۔

دوم، حکمرانی دل پر کرنا چاہئے، تاکہ لوگ ہمیشہ ساتھ دیں، جیسا کہ کہانی انکل کے خلاف کمیشن کی رپورٹ آئی تو حکومت نے اسے گرفتار کروادیا، مگر حکومت کے خلاف لوگوں نے آواز بلند کی، انہیں بری کروانے کے لئے بچوں نے بھی ہنگامہ کیا، وجہ یہی تھی کہ انکل نے لوگوں کے دلوں پر حکمرانی کی تھی۔

نواں باب ___ **پھولی ھوئی لومڑی**

اس میں طاقت ور اور کمزور ممالک کے تعلق سے اقوام متحدہ کی جانبدارانہ پالیسی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

دسواں باب ___ **گائے اور راکشش**

اس میں ہندوستانی منظرنامہ پر سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ کیسے ہندو مسلم باہم شیر وشکر ہوکر رہتے ہیں، مگر فرقہ پرست عناصر دونوں کے درمیان تلخیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، گائے ملک کی علامت ہے، اس کے دودھ سے ملک

کے پورے باشندگان فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر ایک موقع آیا کہ دودھ راکشش آکر پی جاتا ہے، ان دونوں گروہ کے لوگوں میں شکوک جنم لینے لگے، وہ دونوں ایک دوسرے کو غلط نگاہ سے دیکھنے لگے کہ شاید اس نے نکالا ہے، مگر دودھ تو راکشش پی لیتا تھا، جو کہ فرقہ پرست ہے اور ہندو مسلمانوں کو باہم لڑانے کا آلہ کار بھی۔

گیارھواں باب___ **سپنا بوٹی**

اس میں مذہبی پیر وفقیر کی کارستانی اجاگر کی گئی ہے کہ وہ لوگوں کے چڑھاوے سے کس طرح اپنا کاروبار کرتے ہیں اور کس انداز سے عورتوں کو توہم پرستی کے جال میں پھانس کر جنسی ہوس کا شکار بناتے ہیں۔

اسی کے ساتھ اس میں یہ بھی دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ نومسلموں کے تعلق سے مسلمانوں کا رویہ اچھا نہیں ہوتا ہے، وہ نومسلموں کا خیال نہیں کرتے ہیں، یہی وجہ ہوتی ہے کہ بہت سے نومسلم دوبارہ اپنے سابقہ مذہب پر لوٹ آتے ہیں، گویا اس میں مسلمانوں کو پیغام ہے کہ وہ نومسلموں کے تعلق سے اپنے رویوں میں نرمی لایے۔

بارھواں باب___ **کھانی سنانے والی زبان**

یوں تو اس ناول کا ہر پیکر یا ہر باب اپنی جگہ ایک اکائی ہے، ایک افسانہ ایک کہانی ہے، مگر الگ الگ تمام ابواب کے درمیان جو باہم لطیف رشتہ ہے، وہ اس باب میں واضح طور پر سامنے آگیا ہے، وہ اس طور پر کہ کہانی انکل نے کہانی سنانے کے لئے بچوں کا انتخاب بس یونہی نہیں کرلیا، بلکہ اس میں بھی کئی ایک راز ہیں، اس انتخاب کی سب سے بڑی وجہ جو نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ بچوں کا ذہن صاف وشفاف ہوتا ہے، اس میں اتاردی جانے والی باتیں پتھر پر لکھی ہوئی تحریر کی طرح نقش ہوجاتی ہیں، کہانی انکل اپنی کہانیوں سے انقلاب برپا کرنا چاہتے تھے، اس کے لئے انہوں نے بچوں کو ہی موزوں سمجھا، کیونکہ بڑے لوگوں سے وہ ناامید ہوگئے تھے، امید کے مطابق ان

کی کہانیوں سے بچوں میں حوصلہ پیدا ہوا، کہانیوں کے اثرات ان پر مرتب ہونے لگے ، بچوں میں آنے والی تبدیلی سے حکومت تو حیران تھی، ایجنسیاں پریشان تھیں، حکومت تو پہلے بھی کہانی انکل کو جیل بھجوا کر دیکھ لیا تھا، مگر لوگوں بالخصوص بچوں کی مخالفت کی وجہ سے انہیں رہا کرنا پڑا تھا، مگر اب جب کہ کہانی انکل کی مقبولیت بڑھ رہی تھی، ان کی کہانیاں انقلاب کا پتہ دے رہی تھیں تو حکومت وایجنسیوں کو انجانے خدشات نے گھیر لیا تھا، اس لئے بالآخر کہانی انکل کی زبان ہی کٹوا دی گئی، حکومت اور ایجنسیوں نے سوچ لیا کہ انقلاب کا قصہ تمام ہو گیا، مگر کہانی سننے والے بچے سامنے آ گئے، انہوں نے یہ احساس دلایا کہ ایک زبان تو کٹ گئی، تاہم کہانی انکل نے جو بے شمار زبانیں تیار کر دی ہیں، وہ اب اثر دکھائیں گی، اب ان زبانوں سے انقلاب برپا ہوگا، لہذا اس طرح کہانی سنانے کے لئے بچوں کا انتخاب صحیح ثابت ہوا۔

'کہانی انکل' بھی غضنفر کا ایک کامیاب ناول ہے، انہوں نے علامتی انداز سے اس کی تمام کہانیوں میں ملکی اور غیر ملکی بے شمار بڑے واقعات کو سمونے کی کامیاب کوشش کی ہے، اس کے علاوہ تمام کہانیوں کو جس باریکی سے ایک لطیف ڈور میں پرو دیا گیا ہے، وہ بھی اپنے آپ میں ایک بڑا فن ہے۔

دو یہ بانی کا زہر

ناول نگار نے ___ دو یہ بانی __ میں ہندوانہ رسم ورواج اور تنگ ذہنیت کے سامنے حقیقت پسندانہ آئینہ کھڑا کر دیا ہے۔

'دو یہ بانی' ایک ایسا ناول ہے، جس میں برہمن اور دلتوں کے درمیان پائی جانے والی تفریق واستحصال کا منظر ہے، نفرت انگیز ڈرامے ہیں، مذہبی رسم ورواج کے نام پر اشیاء خوردونوش کو برباد کرنے والی ذہنیت پر طنز ہے، ڈھونگی بابا کی نقاب کشائی ہے، انصاف پسندی کا خون ہے، مذہبی گیدڑ بھبھکی ہے، بیٹے کے تئیں ماں کی ممتا ہے اور مذہبی گھیرابندی کا خوف بھی، مذہبی حد بندیوں کی وجہ سے باپ بیٹے اور شوہر بیوی کی جدائی ہے، ناکام عشق کی دلدوز داستان ہے، دیہاتی طرز معاشرت ہے اور مذہبی تنگ نائیوں کے خاتمہ کے لئے بے چین دل ہے، درمند دماغ ہے، مثالی حوصلہ اور قابل قدر جذبات ہیں۔

اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ دو یہ بانی سننے کی وجہ سے برہمنوں نے جھگرو کے کانوں میں سیسہ پگھلا کر ڈال دیا ہے، جھگڑو دلت طبقہ سے تعلق رکھتا ہے، دراصل اس کا گھرانہ برہمن بابا کے خاندان کی خدمت کے لئے مامور ہے، بالو جھگرو کا لڑکا ہے ، بالک سے بالو کی دوستی ہو جاتی ہے، جو کہ اس گھر میں نوکر کی حیثیت سے کام کرتا ہے،

بالک ہمیشہ بالو کے ساتھ دلتوں سے کی جانے والی ناانصافی پر بات کرتا ہے، اس کی وجہ دریافت کرتا ہے، مگر بالو ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتا ہے کہ مجھے نہیں معلوم، ہندو مذہب کے مطابق برہمن کے لئے دویہ بانی سننا جائز ہے مگر دلتوں کے لئے نہیں، بالو اور بالیشور کی دوستی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ بالو کو دویہ بانی سناتا ہے، بالو اپنے باپ کو ملنے والی سزا کی وجہ سے خوف کھاتا ہے، اس لئے وہ دویہ بانی سننے سے انکار کرتا ہے، لیکن بالک کی یقین دہانی پر کہ وہ کسی سے نہیں بتائے گا، وہ دویہ بانی سننے پر راضی ہو جاتا ہے، مگر ایک وقت وہ بھی آتا ہے کہ دویہ بانی سننے کی پاداش میں بالو کے کانوں میں بھی سیسہ پگھلا کر ڈال دیا جاتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس ناول کی پوری کہانی برہمن واد اور دلتوں کی اونچ نیچ میں الجھی ہوئی ہے۔

اس سے بڑھ کر ہندوازم کی تنگ نائی اور کیا ہوگی کہ خالص مذہبی عبادات میں بھی ذات طبقہ کی وجہ سے تفریق کی جاتی ہے، دلتوں کے تئیں برہمن کی زیادتیوں سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ دلت انسان نہیں، اسے دنیا میں کھل کر جینے کا حق نہیں، اسے پڑھنے لکھنے کا حق نہیں۔

دلتوں کے تعلق سے برہمن کی تفریق ونفرت کی دراصل وجہ یہ ہے کہ دلتوں کی پیدائش پیر سے ہوئی ہے اور برہمنوں کی سر سے، سر سے پیدا ہونے والا افضل و برتر ہے اور پیر سے پیدا ہونے والا خادم، کمزور اور ناپاک ہے۔

بالک ہر دم اس اونچ نیچ اور ناانصافی پر پریشان رہتا ہے کہ آخر بالو یا بالو کے محلے والوں کو دویہ بانی سننے کی سزا کیوں دی جاتی ہے، کیا وہ انسان نہیں، کیا وہ ہندو نہیں ؟ چنانچہ وہ ہر ایک سے اس تفریق کا راز جاننا چاہتا ہے، مگر کہیں اسے تشفی بخش جواب نہیں مل پاتا ہے، ایک دن اس نے گرو جی سے اس تفریق کے متعلق گفتگو کی: ــــــــ

''اوہ... تو تم یہ جاننا چاہتے ہو کہ جھگرو ہم سے بھِنّ کیوں ہے اور چمٹولی میں

گندگی کا کارن کیا ہے؟'

'جی گرو جی'

'تمہارے پہلے پرشن کا اتر یہ ہے کہ ہم سر سے جنمے ہیں اور جھگرو پاؤں سے،'
بالک اس جواب پر بھونچکا ہو کر گرو جی کی اور دیکھنے لگا۔
'لگتا ہے، تمہاری سمجھ میں نہیں آیا'
'جی گرو جی'

'بات یہ ہے کہ برہمن نے ہمیں، ارتھات، ہمارے پرتھم پوروج کو، اپنے سر سے جنم دیا تھا اور جھگرو کے پرتھم پوروج کو اپنے پاؤں سے نکالا تھا، سر اور پاؤں میں جو انتر ہوتا ہے، وہی ہم میں اور جھگروں میں ہے، ہم سر کا استھان رکھتے ہیں اور جھگرو پاؤں کا، سر اوپر ہوتا ہے اور پاؤں نیچے، لگتا ہے، اب بھی تمہاری سمجھ میں نہیں آیا ہے'

'جی'

'اس کے لئے بھی سے چاہئے، اب رہا تمہارا دوسرا پرشن کہ چٹولی میں گندگی کیوں ہے تو اس کا اتر ہے کہ چٹولی والے گندگی چاہتے ہیں'
بالک پھر بھونچکا میں پڑ گیا، آشچر یہ پرکٹ کرتے ہوئے بولا 'گرو جی، گندگی کیا کوئی اچھی وستو ہے کہ لوگ اسے چاہیں گے؟'

'اچھی وستو تو نہیں ہے، پرنتو وہ اسے چاہتے ضرور ہے، یدی وہ چاہتے نہیں تو اپنے گھر آنگن اور آس پاس میں کوڑے کرکٹ کا ورمل متر کا ڈھیر کیوں لگاتے؟'

'پرنتو وہ کوڑے کرکٹ اور مل متر کا ڈھیر کیوں چاہتے ہیں؟'

'بالک کے اس کیوں پر گرو جی چپ ہو گئے'۔" (صفحہ 30,31)

اس مکالمہ میں مذہبی حد بندی ایک معمہ بن کر سامنے آگئی ہے، جو کہ شاید خود ہندو برادران کی سمجھ سے بھی بالاتر ہے، اسی مذہبی تفریق کی وجہ سے بہت سے ایسے پروگرامس کرائے جاتے ہیں، جس میں دلتوں کی تضحیک ہوتی ہے، ایسے ڈرامے

ہوتے ہیں، جن میں انہیں پیر سے پیدا ہوتے دکھایا جاتا ہے، خود اس ناول میں بھی ایسے کئی ایک ڈرامے ہیں، جن میں ایسی تفریق دکھائی گئی ہے۔

بالک کے سینہ میں ایک ایسا دل تھا جو انسان ہونے کے ناطے چمٹولی کے لوگوں کے مسائل پر روتا تھا، یہی وجہ تھی کہ اس نے جھگرو کی عیادت بھی کی، جس کی مخالفت خود بالک کے دادا نے کی اور چمٹولی جاتے ہوئے لوگوں کی جو نگاہیں اٹھتی تھیں، ان سے بھی ایسا ہی محسوس ہوتا تھا کہ برہمن کا دلتوں کے دکھ درد میں شامل ہونا کوئی گناہ ہے۔

بالک کے لئے دو یہ بانی پر دلتوں کو ملنے والی سزا خود ایک بڑا مسئلہ تھا، مگر اب چمٹولی کی طرز معاشرت، وہاں کی گندگیوں کا معاملہ بھی پریشان کرنے لگا، اس معاملہ پر اس نے اب دماغ کھپانا شروع کر دیا۔ یہیں پر ناول نگار نے بالک کی پریشانی کے ساتھ ساتھ دیہاتی طرز معاشرت کی بھی جھلک دکھادی ــــــــ

''سنکری، اندھیری، گندی، گھنونی، گوبر اور کیچڑ میں سنی درگندھ بھری گلیاں اسے چکر میں ڈالنے لگیں، بالو کے ساتھ وہ آگے بڑھتا جا رہا تھا، پر راستے میں بھول بھلیاں ختم ہونے کو نہیں آ رہی تھی۔

مکانوں کے دروازے کے آگے بندھے، بیٹھے، کھڑے بیل، گائے بھینس بھیڑ، بکری، کتا، سور کے ساتھ کھڑے، بیٹھے لوٹتے بگتے، موتتے، ننگ دھڑنگ، میلے کچیلے، کالے کلوٹے ٹیڑھے میڑھے بیڈول، مریل بچے بھی اس کی آنکھوں میں سمانے لگے۔'' (صفحہ 17:)

ہون جو مذہبی فریضہ ہے، اس کی ادائے گی کے لئے تو سارے ہندوؤں کو ایک ہی طریقہ اختیار کرنا چاہئے، مگر اس میں بھی وہ تفریق کرتے ہیں:

''یہ سب تو ٹھیک ہے کاکا، پرنتو یہ اناج، یہ گھی تیل آگ میں کیوں ڈالا جا رہا ہے' کاکا نے بالک کے اور دھیان سے دیکھا، کچھ سوچا، پھر جواب دیا 'یہ ہون اسی پرکار کیا جاتا ہے، ارتھات اس ہون میں کھان پان کی سامگری ڈال کر انن

دیوتا کو رجھایا جاتا ہے'

'ان دیوتا کیا اناج کھاتے ہیں، کیا وہ گھی تیل پیتے ہیں؟'

'ہاں! دیوتا جو دیتا ہے، اسے وہ چاہتا بھی ہے'

'کاکا اپنے کل کے لوگ دیوتا پر اناج اور گھی تیل کیوں نہیں چڑھا رہے ہیں؟'

'برہمن تو سویم دیوتا سروپ ہوتے ہیں، بھلا دیوتا کہیں اپنے اوپر بھی چڑھاوا چڑھاتا ہے،.......برہمن پوجا پاٹھ کراتے ہیں، اس لئے وہ بھی دیوتا سروپ ہیں' یہ بات بالک کی سمجھ میں نہ آ سکی، اس کے ذہن نے فوراً سوال اٹھا دیا، کہیں پوجا پاٹھ کرانے سے منوشیہ دیوتا ہو جاتا ہے۔ (صفحہ:56,57)

اس پیراگراف میں دو باتیں ہیں۔

ایک برہمن اور دلتوں کے طریقۂ عبادت یعنی تفریق کی جھلک، یعنی دلت جو خود غریب ہے، پسماندہ ہے، وہ گھی تیل اور دیگر چیزوں کے ساتھ ہون کے لئے موجود ہے، مگر برہمن کے پاس ہون کے لوازمات نہیں، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بجائے دلت کے برہمن ان چیزوں کا اہتمام وانتظام کرتے، کیونکہ ان کے پاس ہر چیز کی فراوانی ہے، تاہم وہ اس زعم میں مبتلا ہیں کہ وہ سر سے پیدا ہوئے ہیں، اس لئے دیوتا ہیں، حالانکہ وہ بھی دلت کی طرح ہی انسان ہے۔

دوسری بات یہ کہ مذہبی عبادت کے نام پر اشیاء خورد ونوش کو آگ کی نذر کر دیا جاتا ہے، جو کہ کسی بھی نظریہ سے عقلمندی کی بات نہیں ہے، ناول نگار یہ سوال اٹھا کر پیغام دینا چاہتے ہیں کہ معاشرہ میں بے شمار ایسے افراد ہیں جو بھوکوں مرتے ہیں، دانے دانے کو ترستے ہیں، پوجا کے نام پر برباد کی جانے والی چیزیں انہیں کیوں نہیں دے دی جاتی ہیں، تاکہ وہ بھی پیٹ کی آگ بجھا سکے۔

اس تفریق کو اجاگر کر کے ناول نگار نے شاید اس نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اگر

ہون کے نام پر دلتوں سے بہت سی چیزیں برباد کرادیں تو وہ خود برہمن کے پاس آ جھکیں گے، ان کے آس پاس منڈلاتے رہیں گے، اس طرح ان کی دلتوں پرابدی بالادستی قائم رہے گی، وہ ہمیشہ ان پر حکمرانی کرتے رہیں گے۔

کہتے ہیں نا کہ شک کی بیماری سب سے بڑی بیماری ہوتی ہے، بالکل یہی صورتحال بالو کے اُس معاملہ میں بھی نظر آتا ہے، جس میں شک کی بنیاد پر بالو کو کسی اوجھا کے پاس لے جایا جاتا ہے، بالو پورے اعتماد کے ساتھ اوجھا سے کہتا ہے کہ مجھے بیتال (بھوت پریت) نے نہیں پکڑا ہے، میں بھلا چنگا ہوں، مگر اس کے گھر والوں کو شک ہے۔

اس واقعہ میں بھی دو باتیں ہیں، اولاً، توہم پرستی کا دلتوں پر ایسا غلبہ، جس سے شاید ہی انہیں چھٹکارا نصیب ہو۔ دوم، بابا کی چالاکی بلکہ عیاری ہے کہ بغیر آسیب زدہ کو آسیب زدہ قرار دے کر اپنا الوسیدھا کر رہے ہیں، چڑھاوے کے نام پر غریبوں سے بہت کچھ لوٹنا چاہ رہے ہیں۔ بابا کی کارستانی اور مکاری کی نقاب کشائی اس واقعہ میں بھی ہے، جس میں بالیشور کے دادا یعنی بابا نے بندیا کے ساتھ غلط حرکت کی اور جسمانی تعلق قائم کر کے خون بہایا، بالو نے جب اس کے متعلق بابا سے پوچھا تو بابا نے جواب دیا کہ بندیا کا پھوڑا پھٹ گیا ہے۔

آج بھی باباؤں کو اچھی نظروں سے دیکھا جاتا ہے، مگر اندرون کے اعتبار سے وہ انتہائی بد بخت ہوتے جا رہے ہیں، معاشرہ کی لڑکیوں میں سما جانا کوئی عیب کی بات نہیں سمجھ رہے ہیں، مگر وہ چھوٹوں اور معاشرہ کے سامنے پاکبازی کا ثبوت دیتے ہیں، مذہبی گیدڑ بھبھکی سے اپنا الوسیدھا کرتے ہیں۔

اس ناول کے ایک اور واقعہ سے بھی اس کا انداز ہوتا ہے، دویہ بانی سننے کے بعد جب بالو کی زندگی میں خود اعتمادی نظر آتی ہے تو بابا پریشان ہو جاتے ہیں، وہ بالو سے پوچھتے ہیں کہ کیا تم نے دویہ بانی سنی ہے، بالو انکار کرتا ہے، مگر جب بابا نے جھوٹ کی قباحت

اجاگر کی تو بالو نے کہہ دیا کہ اس نے دو یہ بانی سنی ہے، گویا بابا نے مذہبی گیدڑ بھبکی سے کام لے کر بالو سے سب کچھ پوچھ لیا، یہ سب پوچھتے وقت انہوں نے یہ بھی وعدہ کیا تھا کہ کوئی بڑی سزا نہیں ملے گی، مگر بالو کے ساتھ وہی ہوا، جو اس کے باپ کے ساتھ ہوا تھا۔

''کل کی سبھا میں تو یہ نہیں کہنا کہ دو یہ بانی بالیشور نے تجھے جان بوجھ کر سنائی، بلکہ یہ کہنا کہ بالیشور جب دو یہ بانی کا پاٹھ کر رہے تھے تو نے چھپ کر سن لیا'

'پر یہ تو جھوٹ ہوگا سوامی! اور میں نے جھوٹ بولا تو میں نرک میں ڈالا جاؤں گا، میرے شریر میں کوڑھ پھٹے گا، راجمن کی بھانتی مجھے بھی رکت کی کلی تھکنی پڑے گی'

'نہیں! یہ ویسا جھوٹ نہیں..... یہ جھوٹ اپنے لئے نہیں بولے گا، بلکہ اپنے سوامی کے لئے بولے گا، اس لئے پونیہ ملے گا، سمجھ گیا نا؟'' (صفحہ:88)

یہاں گیدڑ بھبھکی ہے تو تعصب اور جانبداری بھی کہ بابا نے بالو کے کانوں میں پگھلا سیسہ ڈالا، مگر بالیشور کے جرم کی پردہ پوشی کی، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بالو کے ساتھ بالیشور کو بھی سزا ملے، کیونکہ اس نے زبردستی بالو کو دو یہ بانی سنائی تھی، بالیشور کو بھی اپنے اس گناہ کا احساس تھا، اس نے کہا کہ مجھے بھی سزا ملنی چاہئے، میں گنہ گار ہوں، مگر مکاری کی انتہائی کرتے ہوئے بابا نے اپنے پوتے کو بچالیا۔

اس ناول کا مطالعہ کردار کے لحاظ سے بھی اہم ہے، مرکزی کردار بالیشور پر غور کرتے ہیں تو دو باتیں نظر آتی ہیں۔ اولاً، وہ انتہائی کامیاب کردار ہے، کیونکہ اس نے مخالف ماحول میں انصاف پسندی کا علم بلند کیا، ماں اور دادا کو مذہبی گھیرابندی کے متعلق مثبت جواب دیا۔ دوم، یہ کردار اس وقت کمزور نظر آتا ہے، جب یہ بالو کو بچا پاتا ہے اور نہ ہی بندیا کو، وہ اس طور پر کہ بالو کے کانوں میں جب سیسہ ڈالا گیا تو اس نے

صرف جذباتی ہوکر کہا کہ مجھے بھی سزا دو، میں بھی مجرم ہوں، ورنہ میں خود اپنے کانوں میں سیسہ ڈال لوں گا، مگر گزرتے وقت کے ساتھ وہ بھی بدل گیا، نہ اپنے کانوں میں سیسہ ڈالا اور نہ ہی ڈالنے کا ہنگامہ کھڑا کیا، وہ اپنے کانوں میں شیشہ ڈالنے کا ہنگامہ ہی کرتا تو بابا کو اپنی ناانصافی پر کچھ نہ کچھ ندامت ہوتی اور پھر وہ آئندہ ناانصافی کا گلہ گھونٹنے میں تردد کرتے، مگر ایسا کچھ نہیں ہوا، جس کی بنیاد پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ کردار یہاں پر کمزور نظر آتا ہے۔

اس کردار کی کمزوری اس وقت اور بھی اجاگر ہو جاتی ہے، جب وہ بندیا کے عشق میں گرفتار ہو جاتا ہے، ایسی صورتحال میں جب کہ بالو کی زندگی کٹھن دور سے گزر رہی ہے، بالیشور عشق کر بیٹھا، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ بالو کے ساتھ جو ہوا ہے، اس کے خلاف زبردست ہنگامہ کرتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ عشق کرنے کی وجہ سے اس کا کردار کمزور نہیں ہے، بلکہ حالات کی پرواہ نہ کرنے کی بنیاد پر اس پر کمزور ہونے کا فیصلہ کیا جا رہا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بالیشور اور بندیا کا عشق سراہے جانے کے قابل ہے۔

عشق کے بعد اس سے شادی کرنے کے فیصلہ سے ایک بار پھر بالیشور کا کردار انتہائی مضبوط نظر آتا ہے، کیونکہ وہ ایک ایسی لڑکی کو جیون ساتھی بنانا چاہتا ہے، جو دلت ہے، معاشرہ کے لحاظ سے کمزور ہے، کوئی بعید نہیں کہ بالیشور جیسے دگر برہمن نوجوان دلت لڑکی سے شادی کرنے لگ جائیں تو دلت کو بھی احترام کی نگاہ دیکھا جانے لگے، اس کا احساس بالیشور کو بھی تھا کہ اس شادی سے صرف اس کا ہی فائدہ نہیں، بلکہ ہو سکتا ہے کہ سماج میں دلت کو بھی اچھی نظروں سے دیکھا جانے لگے۔

شادی کے فیصلہ سے بالیشور ایک بار طاقتور کردار بن کر ابھرا، مگر پھر دو باتوں کی وجہ سے یہ کردار کمزور نظر آنے لگا۔

اولاً، شادی نہ کر پانا اس کی کمزوری کی دلیل ہے، کیونکہ مخالف ماحول تھا، ماں نے

بھی اس کی مخالفت کی تھی، بابا کو پتہ چلا تو انہوں نے بھی سخت مخالفت کی، ہر ایک کو یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ بابا کی مخالفت کچھ بھی کر سکتی ہے، بابا کی ہی مخالفت یا سازش کا نتیجہ تھا کہ بندیا کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، مگر یہ افواہ اڑائی گئی کہ بھیکو کی لڑکی بندیا کو کالے نے کاٹ لیا ہے، اس ماحول میں ضروری تھا کہ بالیشور آناً فاناً بندیا سے شادی رچا لیتا، اگر اس کی شادی ہو جاتی تو کسی حد تک معاشرہ کو یہ پیغام جاتا کہ کوئی برہمن کسی دلت لڑکی سے شادی کر سکتا ہے۔ اونچ نیچ والی ذہنیت کو دھچکا لگتا۔

دوم، بندیا کے مرنے کے بعد بالیشور نے ایسا کوئی قابل ذکر عمل نہیں کیا، جس سے محسوس ہو کہ بالیشور نے سازش کا پردہ فاش کرنے کی کوشش کی ہو، اگر بالیشور یہ کوشش بھی کر لیتا کہ قاتل سامنے آ جائے تو اس کردار کی کمزوری دور ہو سکتی تھی۔

مختصر یہ کہ بالیشورا اپنے دونوں قریبی بالو اور بندیا کو بچا نہیں پایا، چنانچہ ہیرو کی ایسی کمزوری ناکامی کی علامت ہے۔

بندیا کے معاملہ میں ہی بالشیور کی ماں کی ممتا سامنے آتی ہے، بالیشور نے ماں سے کہا کہ وہ ہر حال میں بندیا سے شادی کرے گا تو ماں نے تمام نشیب و فراز سامنے رکھ دئے کہ یہ شادی مشکل ہے اور بندیا سے زبردستی بابا کے جنسی تعلق کا بھی ذکر کر دیا تا کہ بالیشور کا ذہن اس سے پھر جائے، مگر اس نے یہ سن کر بھی فیصلہ نہیں بدلا اور اپنے ارادہ کی تائید کے لئے یہ کہا کہ بندیا میرے نطفہ سے حاملہ ہے، یعنی جب یہ صورتحال ہے تو شادی ضرور ہونی چاہئے، یہ سن کر ماں نے جو کہا اس میں ماں کی ممتا کی جھلک بھی ہے۔

''بیٹے! تمہاری باتیں سچ مچ میرے من کو چھو رہی ہیں، پرنتو میں بابا کے ہردیہ کو نہیں بدل سکتی، وہ کداپی اس کے لئے تیار نہیں ہوں گے، جو تم چاہ رہے ہو، اور میں بھی ان کے وِرودھ جانے کی ساہس نہیں کر سکتی... میں تمہارا ہردیہ بھی دکھانا نہیں چاہتی، بیٹے میں تمہیں کھونا نہیں چاہتی، میری تو سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا ہے۔''

'ماں! مجھے کیول تمہارا آشرواد چاہئے، میں اپنی لڑائی سویم لڑوں گا'

'میرا آشرواد تو سدیو تمہارے ساتھ رہے گا، پرنتو بیٹے! تم جس لڑائی کی بات کر رہے ہو، یہ کوئی سرل لڑائی نہیں ہے، یہ لڑائی ایک ویکتی سے تو ہے نہیں کہ اس سے لڑ کر سمسیا کا سمادھان نکال لیں، میں یہ نہیں کہتی کہ تم ہار جاؤ گے، بھگوان کرے تم جیت جاؤ'۔'' (صفحہ 116)

اس مکالمہ میں صاف ظاہر ہے کہ اب ماں کو بھی برہمنوں کی تنگ نائی سمجھ میں آ گئی ،اس لئے کسی نہ کسی سطح پر بالیشور کو بندیا سے شادی کی اجازت دے دی، اس لڑائی میں جیت جانے کی دعا بھی کر رہی ہے، مگر ماں کے سامنے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ کیسے بابا کے دل کو بدل دے اور ریتی رواج کو کچل دے، ماں کا کردار واقعی انتہائی کامیاب ہے۔ اس کردار کی کامیابی کی دو وجہیں ہو سکتی ہیں۔

اول، ماں کی وفور شفقت ہے، یہی وجہ تھی کہ بیٹے کو آشیرواد دے رہی ہے، مگر ساتھ ساتھ اسے خدشات سے آگاہ بھی کر رہی ہے۔

دوم، بالیشور کے سمجھانے پر برہمن کی ریتی رواج اور گھیرابندی تو ماں کو نظر آئی ، مگر مکمل عورت کا کردار ادا کرتے انہیں خاموشی میں ہی عافیت نظر آئی ، یہ کچھ مشکل نہیں تھا کہ یہ سب سن کر کوئی عورت جذباتی ہو جائے اور فی الفور معاشرہ سے دو دو ہاتھ کرنے کو تیار ہو جائے ، ماں کو احساس ضرور ہو گیا تھا کہ اگر بالیشور جیسے چند جوانمرد تیار ہو گئے تو معاشرہ میں دلتوں کے استحصال کی جو کیفیت ہے، ختم ہو سکتی ہے۔ گویا اس معاملہ میں ماں کی خاموشی مصلحت پسندی کی واضح دلیل ہے۔

غضنفر کا یہ ناول بھی جملہ خصوصیات کہانی ، مکالمہ ،منظر نگاری اور کردار کے اعتبار سے انتہائی اہم ہے، وہی دل آویز منظر نگاری، وہی شستہ مکالمہ، جو ان کے دیگر ناولوں میں نظر آتے ہیں، مگر اس میں ناول کا مرکزی کردار ذرا کھٹکتا ہے، غضنفر نے برہمن اور

دلت کے جس کشمکش اور استحصال کو اس میں دکھانے کی کوشش کی ہے، وہ کوئی نئی بات نہیں ہے، مگر ان کا یہ کمال ہے کہ انہوں نے مکالمہ، کردار اور پلاٹ کے لحاظ سے ایک نئے پن کا احساس دلایا ہے، اسی نئے پن کی وجہ سے 'دویہ بانی' اپنی اہمیت ثابت کرتا ہے کہ وہ ایک بڑا ناول ہے۔

پانی کی خشکی

''پانی'' ایک ایسا ناول ہے، جس میں اولوالعزمی اور حوصلہ مندی کے نظارے ہیں ،انسانی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہ کرنے والی تحقیق واختراع اور دنیا و مافیہا سے بے خبر عبادت گزاروں پر تنقید ہے، مقفیٰ و مسجع عبارت آرائی ہے، داستان کی رومان پرور فضا تو ہے، مگر اختتام نہیں۔

اس ناول کی کہانی کچھ یوں ہے کہ بے نظیر (جو مرکزی کردار ہے) پیدا ہوتے ہی پانی کے مسائل سے دوچار ہوتا ہے، بچپن میں اس کی ماں کی چھاتیاں خشک ہو جاتی ہیں ،اسے دوا دینے کے لئے ماں دودھ نہ ہونے کی وجہ سے لعاب استعمال کرتی ہے، جوں جوں اس کی زندگی کی گاڑی آگے بڑھتی ہے توں توں پانی کے لئے اسے بیقرار ہونا پڑتا ہے، اپنے قہر زدہ حلق کو تر کرنے کے لئے ایک دفعہ وہ کسی تالاب کے پاس گیا تو دیکھتا ہے کہ تالاب پر نہنگوں کا قبضہ اور پیاس سے بے حال افراد اس کے ارد گرد کھڑے ہیں ،لوگوں کے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی بے نظیر نے نہنگوں کے اوپر پتھر چلا دیا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہنگ تو چلے گئے، مگر پانی کو زہر آلود کر دیا، اس کے زہر کو ختم کرنے کے لئے کوہِ زہر مہرہ کاٹ لانے کی ضرورت تھی، چنانچہ یہ بھی کاٹ لایا گیا، مگر کسی طرح اس تالاب کو دیواروں کے حصار میں بند کر دیا گیا تو پھر پیاس کا احساس ہوا اور بے نظیر نے پانی حاصل کرنے کی لاکھ کوشش کی ، وہ پانی کے حصول کی صورت

نکلوانے کے لئے دارالتحقیقات گیا اور زاہدوں کے پاس بھی، مگر نہ تحقیق کرنے والوں نے پیاس بجھانے کا کوئی بہتر طریقہ بتایا اور نہ ہی زاہدوں نے، اسی طرح خضر بھی اسے آب حیات پلانے لے گئے، مگر وہاں بھی پیاس بجھ نہ سکی۔

اس ناول کی کئی خصوصیات ہیں، کیوں کہ اسے ایک علامتی ناول کہا جا سکتا ہے تو عصر حاضر کے تناظر میں ظاہری کہنے کی بھی گنجائش ہے، علامتی اس اعتبار سے ہو سکتا ہے کہ انسانی زندگی کے لئے جس طرح پانی کی ضرورت ہے اسی طرح دیگر بنیادی لوازمات کی بھی، یعنی کہ ناول نگار نے پانی کے پردہ میں یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ انسان بنیادی ضرورتوں کے فقدان کی وجہ سے پرسکون زندگی نہیں بسر کر پاتا ہے، کیونکہ دنیا پر مکار و عیار اور شرانگیزوں کا قبضہ ہے، اس لئے بنیادی ضروریات کی تکمیل کے لئے ان سے لوہا لینا پڑتا ہے، باوجود اس کے زندگی پرسکون نہیں ہو پاتی ہے۔

ظاہری اس طور پر ہو سکتا ہے کہ آج پانی کی قلت روز بروز بڑھتی جا رہی ہے، اس کا حصول چیلنج بنتا جا رہا ہے، پانی زندگی کے لئے جس قدر ضروری ہے، اس سے ایسا ہی لگتا ہے کہ اسے بآسانی ہر جگہ دستیاب ہونا چاہئے، ہر امیر و غریب کے لئے اس کا حصول کٹھن نہ ہو، مگر آج بڑے بڑے شہروں بلکہ بعض دیہاتوں میں پانی کے لئے خوب جتن کی ضرورت پڑتی ہے، زمانہ شناسوں کا ماننا ہے کہ پانی کے لئے ہی تیسری عالمی جنگ ہو سکتی ہے، اس تناظر میں اگر اس ناول کو دیکھا جائے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ درحقیقت پانی کی تلاش کے لئے ہی بے نظیر کو در بدر کی ٹھوکریں کھانا پڑیں، مگر پھر بھی پانی نصیب نہیں ہوا، اس نظریہ سے دیکھنے کے بعد ایسا لگتا ہے کہ یہ ناول علامتی نہیں، بلکہ ظاہری ہے۔

پانی کے علاوہ اس ناول میں دو تین علامتیں بھی کچھ ایسی ہیں، جو انتہائی پرکشش ہیں اور عہد حاضر کی عکاس بھی، ''نہنگ'' دراصل ایسے افراد ہیں، جنہیں لوگوں کی

صلاحیت ولیاقت کی کوئی قدر نہیں ، وہ ہمیشہ اپنا الوسیدھا کرنا مقصد اولیں تصور کرتے ہیں ، یہی وجہ ہے کہ اچھے لوگوں کا بھی استحصال ہوتا ہے، انہیں بے نظیر کی طرح چین وسکون نصیب نہیں ہو پایا ہے، اسی طرح ''آبیازہ'' بھی ایک ایسی علامت ہے، جو عام انسان کے لئے مفید نہیں ہے، عام انسان اپنی ضروریات پوری کرنے کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر نہنگ انہیں یہ آبیازہ دے کر مقصد اصلی سے دور کرنے کی کوشش کرتے ہیں، انہیں بہلا پھسلا کر اپنے لئے راہ ہموار کرتے ہیں، انہیں آبیازہ یا آبیازہ جیسی چیز دے کر کچھ کر گزرنے سے روک لیتے ہیں اور وہ لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ یہ اصل ہے، مگر اس کی اہمیت لالی پاپ کی سی ہوتی ہے۔

اس ناول میں داستانوی فضا ہمیشہ چھائی رہتی ہے ، یہی وجہ ہے کہ کہیں کہیں طلسماتی واقعات کا احساس ہوتا ہے، تمام داستانوں میں بالعموم ایک ہی قصہ ہوتا ہے کہ ایک ہی نظر میں کوئی شہزادہ کسی شہزادی پر فریفتہ ہو جاتا ہے، اس کے حصول کے لئے ہر ممکن کوشش کرتا ہے، بلکہ مافوق الفطرت چیزوں کا سہارا لے کر بھی اپنی محبوب تک پہنچتا ہے یعنی اس طرح اختتام تک دونوں مل جاتے ہیں اور ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگ جاتے ہیں، مگر اس ناول میں افسانوی فضا تو ضرور ہے، مگر لاکھ جتن کے باجود بھی پانی نصیب نہیں ہو پاتا ہے یعنی اختتام داستان جیسا نہیں۔

مافوق الفطرت عناصر بھی داستان کو دلچسپ بناتے ہیں، عام طور پر ایسا ہی ہوتا ہے کہ داستان کے مرکزی کردار میں بچپن سے ہی وہ کمالات دکھائے جاتے ہیں، جو بڑی عمر والوں میں بھی نہیں ہوتے ہیں، داستان کا ہیرو واقعی اپنے کردار کے اعتبار سے ہیرو نظر آتا ہے، پانی کا جو مرکزی کردار بے نظیر ہے، اس میں بھی ایسے ہی کمالات نظر آتے ہیں، کیوں کہ اسے پیدا ہوئے کوئی زیادہ دن نہیں گزرتے کہ اپنی جوانمردی اور بلند حوصلگی کا مظاہرہ کرنے لگتا ہے۔

''اس بار ماں نے پہلی رطوبت کے بجائے اپنے منہ کے لعاب میں سفوف گھولا اوراسے انگلی کی مدد سے بلبلاتے ہوئے بچے کے منہ کے اندر داخل کردیا۔
بچہ دھیرے دھیرے پھر نیند کے غار میں اتر گیا۔
'ماں! ام، مم' آنکھوں کے ساتھ بچے کی زبان بھی کھل گئی۔
ماں پانی پلانے کے بجائے اسماعیل اورآب زمزم کی کہانی سنانے لگی، آہستہ آہستہ بچے کی آنکھیں پھر بند ہوگئیں۔ دوبارہ جب پلکیں کھلیں تو اس نے خود کو ماں کی آغوش کی جگہ بیابان کی کنکریلی زمین پر پایا۔ اسے سینے میں جلن، گلے میں خشکی، ہاتھ پیر میں اینٹھن اور زبان میں چبھن محسوس ہوئی۔ بدن بے تاب ہوا تھا۔

جھاڑیوں سے الجھتا، کانٹوں سے جوجھتا، گرتا پڑتا ہوا ایک کنارے پہنچا۔ ایک تالاب دکھائی پڑا، ہونٹوں کی پپریوں میں بہتے ہوئے پانی کی سرسراہٹ محسوس ہوئی، لڑکھڑاتے ہوئے پیروں میں چاق وچوبند بیساکھیاں بندھ گئیں، وہ تالاب کی طرف دوڑ پڑا''۔ (صفحہ:10-11)

اس پیراگراف سے صاف اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے اپنے کردار کو داستانوی کردار بنادیا ہے، ابھی وہ ماں کے پاس تھا، دودھ پیتا تھا، مگر چند جملوں کے بعد اتنا توانا اور تندرست ہوگیا کہ نہنگوں سے لوہا لینے کو تیار ہوجاتا ہے، اگر داستان میں ایسی کیفیت ہو تو کوئی معیوب نہیں، مگر ناولوں میں فی الفور بچے کو ہیرو بنادینا اور اس سے ایسے بڑے بڑے کام لیتے ہوئے دکھانا بڑا عجیب لگتا ہے، چنانچہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ ناول نگار نے عجلت سے کام لیا ہے، جو کہ ناول کی روح کے لئے مناسب نہیں ہے۔
اگر یہ کہا جائے کہ ناول نگار نے داستان کے پیش نظر جلد بازی نہیں کی، بلکہ بے نظیر کی زندگی کے درمیانی زمانہ کو حذف کردیا ہے، اس لئے داستانوی کردار نظر آتا ہے، چاہے جو بھی مگر جملوں کی ساخت اس بات پر شاہد ہے کہ انتہائی جلد بازی سے کام لیا گیا ہے۔

ناول نگار نے دنیا میں ہونے والی برق رفتار تحقیق واختراع کا پاس ولحاظ تو رکھتے ضرور ہیں ، مگر ان اختراعات وتحقیقات کو اس وقت نشانہ تنقید بناتے ہیں ، جب وہ انسانی بنیادی ضرورتوں کو پورا نہیں کرپاتے ہیں ، ناول نے یہ دکھایا ہے کہ تحقیقات کا جو عمل جاری ہے ، اس کا معیار تو اعلی ہے ، مگر بنیادی ضروریات کی تکمیل کی قوت ان میں نہیں ہے ، بلکہ جنسی جذبات کو بھڑکانے اور خواہشات کی دبی چنگاری کو ابھارنے والی چیزیں ہر تحقیق میں چھپی ہیں۔

''مہ لقاؤں نے اپنے مہتابی ہاتھوں کے سہارے ایک ملائم معطر بستر پر لٹادیا ، اس کے لیٹتے ہی کچھ منتخب مہ لقائیں مدارات محبوبانہ میں مصروف ہوگئیں ، ان میں سے چار بستر کے چاروں طرف سرخاب کے پروں کا پنکھا لے کر کھڑی ہوگئیں ، دو سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنے لگیں ، دو پائنتی کی جانب اس انداز سے بیٹھ گئیں اور ان کے مہ لقاؤں کی ماہتابی انگلیاں رقص کرنے لگیں۔

دو اس کے دونوں پہلوؤں میں لیٹ گئیں اور باقی خواب گاہ سے باہر نکل گئیں ، سرخاب کے پروں کی ٹھنڈک __ انگلیوں کے سحر آگیں لمس ، سپید مخملی جسموں کی حرارت اور بستر استراحت کی نرماہٹ کی ملی جلی مدہوش کن کیفیت اس کے رگ وپے میں سرایت کرتی گئی اور اس کی پلکیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں ''(صفحہ:51)

بے نظیر نے دارالتحقیقات پہونچ کر یہ سوچا تھا کہ واقعی اس کی پیاس بجھ سکتی ہے یا بنیادی ضرورتیں پوری ہوسکتی ہیں ، مگر تحقیقات کرنے والے ایسی تحقیقات کررہے ہیں جو بنیادی ضرورتوں سے ہم آہنگ نہیں ہیں اور پیاس بجھانے کے لئے جو آبیازہ دیا تھا ، وہ بھی پیاس بجھانے کے لئے اوس چاٹنے جیسا تھا ، مزید تحقیقات کرنے والے کو ایسی

کوئی بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی کہ انسان کو پانی مل سکے، چنانچہ وہ تحقیقات سے مایوس ہوکر باہر نکل آیا۔

ناول نگار ایسے صوفیوں اور ذکر میں مشغول رہنے والوں پر بھی طنز کیا ہے، جو دنیا وی لوازمات سے بے خبر ہوکر صرف عبادت گزاری میں لگ جاتے ہیں، بے نظیر جب دارالتحقیقات سے مایوس ہوگیا تو بزرگوں کے پاس گیا کہ وہ اسے پیاس بجھانے کے لئے کچھ دیں گے، مگر انہوں نے جن اذکار میں اسے پھانس کر آخرت کی باتیں بتادیں ، ان سے ایسا ہی محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے دنیا کو بس یونہی پیدا کردیا ہے، دنیاوی چیزیں انسان کے لئے نہیں ہیں، حقیقت تو یہ ہے کہ خدا نے تمام ضروریات زندگی کے ساتھ عبادت گزاری کو بہتر قرار دیا ہے۔

''پانی''، غضنفر کا پہلا ناول ہے، اگر یہ کہا جائے کہ کسی نہ کسی حد تک غضنفر کے تمام ناولوں میں اس ناول کا عکس نظر آتا ہے تو کوئی نامناسب بات نہیں ہوگی۔ گویا ناول پانی تمام ناولوں کی تمہید ہے، برہمن واد کی برتری کا احساس ان کے کئی ناولوں میں ہوتا ہے، بلکہ ''دیویہ بانی'' پورا ناول اسی تناظر میں ہے، یہ عکس پانی میں بھی ہے، ''پانی'' میں جس انداز سے برتری کی جھلک ہے، اس سے ایسا ہی لگتا ہے کہ برہمن راکشش کو ساتھ بٹھا کر امرت پلا سکتے ہیں، مگر انسانوں کو نہیں۔

> ''لیکن بھگوان دیوتا کے ساتھ وہ کچھ دوسرے لوگ بھی تو پی رہے ہیں؟
> 'اچھا وہ! وہ دشٹ راکش ہیں، ان میں سے کچھ نے راکشش شکتی اور مایاوی شڈینتر سے دیوتاؤں کے ساتھ چھل کیا اور تھوڑا سا امرت پراپت کرلیا
> ''(صفحہ 90)

یوں تو غضنفر اپنے تمام ناولوں میں عشقیہ راگ کم ہی الاپتے ہیں اور جنسی جذبات کو بھڑکانے والے مناظر سے بھی بچنے کی کوشش کرتے ہیں، مگر اس ناول میں ایسے مناظر

بہت زیادہ ہیں، ہوسکتا ہے کہ انہوں نے ان مناظر کو ابھا کر دنیا میں ہونے والی تحقیق واختراع کی تنقید کی ہو، مگر کچھ بھی ہو اس میں ہیجان انگیزی بہت زیادہ ہے۔

"لہراتے لہراتے اس نے اپنے اسکرٹ کا بٹن بھی کھول دیا، اسکرٹ کمر سے کھسک کر زمین پر آگیا، کولھوں اور رانوں کے درمیان پھنسی ہوئی صرف سیاہ رنگ کی پینٹی باقی رہ گئی۔

سیاہ برا اور پینٹی میں اس کا سڈول گورا بدن لہرا لہرا کر قیامت ڈھانے لگا، دو چار گردشوں کے بعد اس نے سیاہ برا بھی اتار دیا، چھاتیوں پر اب مختصر سا گلابی رنگ کا برا رہ گیا، گلابی برا کے اندر سے گلابی رنگ کی چھاتیاں گلاب کی پنکھڑیوں کی طرح پھڑ پھڑانے لگیں۔

ناچتے ناچتے اس نے سیاہ پینٹی بھی اتار دی، سیاہ پینٹی کے اندر سے گلابی پینٹی باہر آگئی، کولھوں کا تین چوتھائی حصہ بے نقاب ہوگیا۔

چند لہروں کے بعد اس نے اپنے جسم سے مختصر سا برا بھی اتار پھینکا، برہنہ تندرست چھاتیاں کھلی فضا میں آزادی کے ساتھ اچھلنے لگیں۔

دو ایک جھٹکوں کے ساتھ اس نے گلابی پینٹی کو جھٹک دیا، حسن کا آخری دروازہ بھی وا ہوگیا، سفید پہاڑوں کے درمیان سرمئی بادل ڈولنے لگے" (صفحہ:64)

مقفع و مسجع عبارتوں اور منظر نگاری کے اعتبار سے ذیل کا پیراگراف بہت خوب ہے، جس میں کشش ہے اور جادو بیانی اپنے شباب پر ہے۔

"اے جواں سال تشنہ لب، گرفتارِ طلسم تاب وتب، آمرے حلقہ آغوش میں آ، آمرے جسم معطر میں سما، برآئے گی ہر مراد تری، تجھ کو مل جائے گی، اک لال پری، دور ہوجائے گی تھکن ساری، مٹ کے رہ جائے گی بے قراری، مے کشی کا مزہ اٹھائے گا، تشنگی کا پتا نہ پائے گا، جسم وجاں میں نشہ سمائے گا، چشم سے استعجاب جائے گا۔
" (صفحہ:28)

زبان وبیان کی تبدیلی کے حوالہ سے اس ناول کا اہم خاصہ ہے، کبھی تو مقفع و مسجع عبارت آرائی کی وجہ سے لگتا ہے کہ داستان کا قدیم طرز ہے، کبھی شستہ اور شگفتہ تحریر کا ایسا مرقعہ، جیسے ادب کی شاہکار ہو، کبھی تو ایسی گنجلک عبارت کہ سمجھ سے بالاتر ہو، دارالتحقیقات میں ریسرچ کرنے والوں کی زبان بھی عجب لذت دے جاتی ہے، زبان کے اس اتار چڑھاؤ سے احساس ہوتا ہے کہ ناول نگار میں زبان کی تمام تر خوبی موجود ہے، چند صفحات کے بدلتے ہی زبان کا رنگ بدلتا نظر آتا ہے، جو ناول نگار کی شعوری کوشش ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہ ناول ''پانی'' پرسوز و پرتاثیر ہے اور دلچسپ بھی، جس میں غضنفر نے پانی کے در پردہ ضروریات زندگی کی حصولیابی کے لئے لوگوں کی بے چینی سامنے رکھ دی ہے کہ دنیا پر شرانگیز لوگوں کا قبضہ ہوگیا، اس لئے تمام لوگوں کو زندگی جینا پہاڑ سا محسوس ہونے لگا ہے۔

فسوں کا فسانہ

''فسوں'' غضنفر کا ایک ایسا ناول ہے، جو ان کے دگر ناولوں 'کینچلی، مانجھی، وش منتھن، شوراب، دویہ بانی اور کہانی انکل' سے کئی معنوں میں مختلف و ممتاز ہے، کیوں کہ اس میں وہ منظر نگاری ہے اور نہ ہی تخیل کی وہ پرواز جو بالخصوص مانجھی، کینچلی اور ان کے دگر نالوں میں نظر آتی ہے، اس ناول کے وسیع کینوس میں سماج کی وہ آواز بھی نہیں ، جس کی وجہ سے قاری غضنفر کے ناولوں کو عزیز رکھتا ہے، اس میں وہ درد بھی نہیں جو تمام قارئین کو یکساں طور پر اپیل کرے۔

اس ناول میں پینتیس پیکر (ابواب) ہیں، ان پیکروں میں سے کوئی دو تین ہی پیکر ایسے ہیں، جن میں عمومی سماج بولتا ہے، ورنہ تو تمام پیکروں میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی آب و ہوا ہے، وہاں کی سرگرمیاں ہیں، وہاں کے نشیب و فراز ہیں، یونیورسٹی کی فضا میں یہ ناول اس طرح الجھ گیا ہے، جس سے احساس ہوتا ہے کہ یہ کوئی ناول نہیں، بلکہ وہاں رونما ہونے والے واقعات کی خبروں کا ایک مجموعہ ہے۔ غضنفر کے بیانیہ اسلوب میں وہ شگفتگی، رعنائی اور دلکشی ہوتی ہے، جو دگر ناول نگاروں کے بیانیہ اسلوب میں نہیں پائی جاتی، مگر ان کا بیانیہ اسلوب اس ناول میں مجروح ہوتا نظر آتا ہے، بیانیہ اسلوب کے ساتھ بھی جب یہ ناول علی گڑھ کی فضا سے باہر نکلتا ہے تو غضنفر کا اسلوب

اپنی انفرادیت درج کروانا شروع کردیتا ہے۔

غضنفر کی ایک بڑی خصوصیت میری نگاہ میں ان کا ''موازنہ'' ہے، وہ اس طور پر کہ غضنفر کسی واقعہ کو بیان کر کے اس کے فوراً بعد کوئی دوسرا ایسا واقعہ بیان کردیتے ہیں، جس سے قاری کے ذہن میں بہت سی باتیں ابھرنے لگتی ہیں اور شہر و دیہات اور مرد وعورت کی خامی وخرابی ابھر کر سامنے آجاتی ہے، مثلاً غضنفر اپنے ایک افسانہ ''پارکنگ ایریا'' میں شہری رشتہ داروں کی بے رخی دکھاتے ہیں، اس کے فوراً بعد دیہات میں رہنے والے رشتہ داروں کی محبت اور اور ان کے حسن سلوک کو سامنے رکھ دیتے ہیں، جس سے شہر اور دیہات کی خامی وخرابی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔اسی طرح اپنے ناول ''کینچلی'' میں مرد وعورت کی ذہنیت کا موازنہ بڑے حسین انداز میں کرتے ہیں، وہ اس طرح کہ مینا (جو اس ناول کی مرکزی کردار ہے) کے ابو اور امی دونوں وقفہ وقفہ سے بیمار پڑ جاتے ہیں، ابو کی بیماری کے زمانہ میں تیمارداری کے لئے اسپتال میں بے شمار خوبصورت نرس ان کے پاس ہوتی ہیں، مگر ابو کا دل امی کی طرف ہی مائل ہوتا کہ وہ ہمیشہ ان کے پاس رہیں، مگر امی جب بیمار ہوتی ہیں تو وہ امی کے پاس نہیں ٹھہر کر دوستوں کے ساتھ ٹہلنے نکل جاتے ہیں، جبکہ امی کا میلان بھی ابو کی طرف ہی ہوتا ہے، مزید ڈاکٹر کا مشورہ بھی کہ امی کے پاس کوئی نہ کوئی ضرور رہے۔بالکل ایسا ہی غضنفر نے کینچلی میں ایک فلم کے دو مناظر سے مرد وعورت کی ذہنیت کا اچھا موازنہ کیا ہے۔اس کے علاوہ ان کے دگر ناول وش منتھن، مانجھی، شوراب وغیرہ میں یہ کیفیت بار بار آتی ہے، جس سے ان کے ناولوں میں درد پیدا ہوجاتا ہے۔ قاری کے احساسات وجذبات بھڑک اٹھتے ہیں، ان کے ذہن ودماغ میں بے شمار سوالات رقص کرنے لگتے ہیں، مگر ''فسوں'' میں اس کا احساس بہت کم ہی ہوتا ہے، مگر جب بھی ایسا موقع آتا ہے تو غضنفر کا یہ ناول بھی موازنہ کے تناظر میں بلند آہنگی کے ساتھ اپنی انفرادیت

درج کرواتا ہے، مجموعی سماج کی آواز تیز تر ہوجاتی ہے، درد وکسک کی آڑی ترچھی لکیریں ابھر کرقاری کے ذہن کو گدگدانے لگتی ہیں اور بے شمار سوالات ان کے دماغ کو دعوتِ فکر دیتے ہیں کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط؟ مثلاً چودھویں پیکر کا موازنہ بھی بہت خوب ہے، جس سے مسلم معاشرہ میں پائی جانی والی اچھی اور بری باتوں سے آگہی ہوتی ہے۔

''....میں اپنے موجودہ پیشہ میں آنے سے قبل ایک گھر میں ملازم تھا، ایک دن اس گھر کی مالکن نے صفائی کے لئے دوسرے میلے کپڑوں کے ہمراہ اپنی اپنی بریزیر بھی میری طرف بڑھادی، جیسے وہ بھی کوئی رومال یا بچے کا انڈرویر ہو، بریزیز کی جب باری آئی تو میرے ہاتھ ٹھٹھک گئے، بیڈوالی ناگن کی بریزیر کوئی اور روپ دھارن کرچکی تھی، میرے تن بدن میں جھرجھری سی دوڑ گئی، رگوں میں چیونٹیاں رینگنے لگیں۔

مجھے یاد آیا صاحب کے دوست ریحان صاحب کو جب باتھ روم جانے کی حاجت محسوس ہوئی تھی تو ان کے جانے سے پہلے ہی میم صاحب دوڑ کر باتھ روم میں ٹنگی بریزیروں کو وہاں سے اٹھالائی تھیں''۔

ایک دن میم صاحب کے حکم کی تعمیل میں ان کے پیر دبا رہا تھا، پاؤں دباتے وقت اچانک میری ماں یاد آگئی۔

ماں بہت دنوں سے بیمار تھی، ان کے دونوں پیروں میں مستقل درد رہنے لگا تھا، حکیم نے تیل مالش کرنے کو بتایا تھا، گھر میں ان دنوں ماں کے علاوہ صرف میں ہی تھا، لہذا اماں کی تیمارداری مجھے ہی کرنی پڑتی تھی، ایک دن ابا جب آئے تھے تو انہیں ماں کو کہتے سنا تھا۔

علو اب بڑا ہورہا ہے، اس سے مالش کرانا اچھا نہیں لگتا، جوان لڑکا ہے، کیا سوچتا ہوگا، کوئی دائی سے بات کیوں نہیں کرلیتے؟

میم صاحب کی موٹی موٹی گداز پنڈلیاں دباتے دباتے میری انگلیوں میں

چنگاریاں بھر جاتیں مگر میم صاحب کے پاؤں برف کے تودے بنے رہتے۔

(صفحہ:92-91)

اس پیکر میں غضنفر نے بہ ظاہر دیندار مسلم معاشرہ میں پائی جانے والی ذہنیت بلکہ حقیقت سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ واقعی مذکورہ سطور میں جن باتوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، وہ دیندار مسلم معاشرہ کا ایک المیہ ہے، اس سے ایسا احساس ہوتا ہے کہ اسلام، اسلام نہیں، ایک کھلونا ہے، یا پھر اس کے ذریعہ دھونس جما کر اپنے کو پاک صاف باور کرانا مقصود ہوتا ہے۔ اسی پیکر میں وہ بات بھی سامنے آتی ہے، جس سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ مسلم دیندار گھرانے کی عورتیں ڈاکیہ، دودھ بیچنے والے، بھنگی وغیرہ کو نامحرم تصور نہیں کرتی ہیں، بلکہ ان کے سامنے حسن کی نمائش کو جائز سمجھتی ہیں، ان کے سامنے اٹھلانے اور تھرکنے میں انہیں کوئی برائی نظر نہیں آتی، ان عورتوں کے کردار سے ایسا ہی لگتا ہے کہ پردہ کا حکم صرف رشتہ داروں اور قریبی لوگوں سے ہی ہے۔ ناول نگار اس ذہنیت کو اجاگر کر کے یہ پیغام دینا چاہ رہے ہیں کہ نامحرم تو نامحرم ہوتے ہیں، چاہے دودھ والے ہوں یا بھنگی، ان سے پردہ کرنا چاہئے، دودھ والے اور گھر میں دگر آنے جانے والوں سے اسی طرح پردہ ہونا چاہئے، جس طرح کہ رشتہ داروں اور ملنے جلنے والوں سے کیا جاتا ہے۔

دوبارہ یہ کہنے میں ذرا بھی باک نہیں کہ ''فسوں'' وسیع کینوس پر محیط ہونے کے باوجود بھی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں قید ہے، یہی وجہ ہے کہ غضنفر نے پہلے پیکر میں وہ سب کچھ دکھانے کی کوشش کی ہے، جس سے مسلم یونیورسٹی کی شان دوبالا ہوتی ہے، وہاں کا ادبی ذوق نکھر کر سامنے آتا ہے اور شعر و ادب پر غور و فکر والی ذہانت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ ٹی ہاؤس میں بغیر کسی پلان کے وہاں کے طلبا ادب کے تعلق سے جس انداز میں گفتگو کرتے ہیں، اس سے ایسا ہی لگتا ہے کہ وہاں شعر و ادب کا عمومی ذوق تھا اور

باتوں باتوں میں ادب کے تعلق سے ایسے سوالات کھڑے ہو جاتے تھے، جو تحقیق طلب ہوتے تھے۔

''الماس! کیا میر سچ مچ قنوطی شاعر تھا؟
نہیں، جو لوگ میر کو قنوطی سمجھتے ہیں ان کی رائے محض چند اشعار پر قائم ہے، اگر وہ پورے میر کو پڑھتے تو شاید ان کی رائے یہ نہیں ہوتی، میر اداس ہونے کے باوجود زندگی سے مایوس نہیں، سچ تو یہ ہے کہ میر کو زندگی عزیز تھی''۔ (صفحہ: 11)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس زمانہ کے طلبا میں کس طرح ادب کا ذوق وشعور تھا، واقعی اگر آج بھی ان چند سطور کو سامنے رکھ کر تحقیق کی جائے تو میر کے سلسلہ میں ہماری رائے بدل سکتی ہے، ان کے اوپر سے قنوطیت کا لیبل ہٹ سکتا ہے۔
یہ ناول علی گڑھ کی خصوصیت کچھ یوں بھی بیان کرتا ہے کہ وہاں کی علمی وادبی فضا میں پروان چڑھنے والے طلبا کس قدر قومی وملکی حالات پر غور وفکر کرتے ہیں، اسی فکر کا ہی نتیجہ تھا کہ حالات کی پروا کئے بغیر انہوں نے اخبار نکالنے کا فیصلہ کرلیا، وہ اپنے اخبار ''لائٹ'' کی روشنی سے معاشرہ کو نہا دینا چاہتے تھے، قوم کی بھلائی کا جذبہ ہی تھا کہ انہوں نے سیاسی پارٹی کے لئے بھی کام کیا، یہ الگ بات ہے کہ ان کا ''بوم کلب'' قائم کرنا اور سیاسی پارٹی سے ربط ضبط رکھنا تعلیمی ادارہ کے قوانین کی رو سے کتنا غلط ہے اور کتنا درست۔
سیاست اور تعلیم وتحقیق کے معیار کو سامنے رکھ کر بھی اس ناول میں بحث کی کوشش کی گئی ہے، جو واقعی توجہ طلب ہے، اخبار ''لائٹ'' کے اجراء کے موقع سے جن موضوعات پر روشنی ڈالی گئی تھی، وہ درحقیقت آج کے تعلیمی اور سیاسی نظام پر ضرب ہے۔
عنوان 'تعلیم کے الٹا سفر' سے ایک اقتباس:

''تعلیم کے اس الٹے سفر کے ذمہ دار ہیں وہ معلم، مدرس، ممتحن، مبلغ، مبشر، مفسر

اور منتظمین جن کے ہاتھوں میں عصائے رہنمائی تھما تو دیا گیا ہے، مگر جو خود اس راہ سے واقف نہیں، جن کی تقرری ان کے اعلیٰ منصبی اور خاندانی برتری کے سبب عمل میں آئی ہے یا ان کی اپنی حکمت عملی، خدمات صدر شعبہ اور افسران اعلیٰ (جن میں تیل مالش بھی شامل ہے) کے نتیجے میں صلے کے طور پر حاصل ہوئی ہے یا ان کے سروں پر کسی شہ زور سیاسی شعبدہ باز کا طلسماتی سایہ رہا ہے''۔ (صفحہ:48)

لگے ہاتھوں ناول نے موجودہ ادب میں پائی جانے والی خصوصیات کا بھی تذکرہ کیا ہے کہ آج کے ادب میں کن کن موضوعات کو مس کیا جاتا ہے اور کن کن باتوں سے نظریں چرائی جاتی ہیں۔

''آپ کا مشاہدہ بہت حد تک صحیح ہے، ہمارے افسانہ نگاروں نے عشق اور فکر کے گھوڑے زیادہ دوڑائے ہیں، رومانی فضاؤں میں سیر کرنے یا آسمانوں میں اڑنے کی سعی زیادہ کی ہے، زمین کی طرف کم دیکھا ہے، عام طور پر ہمارے افسانہ نگار چھوٹی چھوٹی باتوں اور زمینی سچائیوں کو خاطر میں نہیں لاتے لیکن ایسی بات بھی نہیں کہ ارضیت سرے سے ہے ہی نہیں، ہمارے افسانوں میں بھی ارضیت ہے، مگر اسے پانے کے لئے خاصی مشقت کی ضرورت ہے''۔

آج تحقیق کا معیار بالخصوص اردو میں حد درجہ گر گیا ہے، وجہ اس کی یہی ہے کہ تحقیق کرنے والے بھی محنت سے جی چراتے ہیں تو تحقیق کرانے والے بھی پہلو تہی اختیار کرتے ہیں، بعض اوقات تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ جاری تحقیقی کام کی نگرانی کا فریضہ انجام دینے والے بھی اس موضوع سے ناواقف ہوتے ہیں یا پھر جان کر بھی انجان بنتے ہیں، ظاہر ہے اس صورتحال میں کئے جانے والے تحقیقی کاموں کا معیار کتنا بلند ہوگا۔

''.....سنا ہے پسں تو لائی ہوں گی؟

'جی'اس نے بیگ سے ایک کاغذ نکال کر میری طرف بڑھادیا۔

'تو یہ ہے آپ کی سناپسس'

'جی، کیوں'

'اچھی ہے'

'اچھا تو کیا ہے، بس یونہی الٹے سیدے خاکے بنالیے ہیں، گائڈ صاحب تو کوئی زیادہ توجہ دیتے نہیں، بتایئے اس میں اور کیا کیا ہونا چاہئے؟'

'میرے خیال سے تو ٹھیک ہی ہے، البتہ ابواب کے عنوانات کی زبان بدل دی جائے اور تھوڑی سی ترمیم سے کام لیا جائے تو یہ سناپسس شاید اور بہتر ہوسکتی ہے'

۔یہ ابھی فائنل تو نہیں ہوئی نا'

'نہیں'

'تب ٹھیک ہے..........''۔

اس مکالمہ میں صاف ظاہر ہے کہ زینہ جس پروفیسر صاحب کی نگرانی میں تحقیق کر رہی ہے، وہ خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اسے دوسرے کے پاس رہنمائی کے لئے جانا پڑ رہا ہے، اس کے سناپسس کی نوک پلک کوئی ایسا فرد درست کر رہا ہے، جو اس کا نگراں نہیں ہے، ہونا تو یہ چاہتے تھا کہ زینہ کے نگراں اچھی طرح نگرانی کرتے، تا کہ وہ اپنے تحقیقی کام کو بحسن وخوبی مکمل کر پاتی۔

ویسے تو اس ناول کے کردار متضاد ہیں اور سیمابی کیفیت کے مالک بھی، متضاد اس معنی میں کہ تعلیمی ادارہ میں انہیں جو ناپسند تھا وہی باہر نکلنے کے بعد محبوب ہو جاتا ہے، سیمابی صفت کے مالک وہ اس طور پر کہ جھٹ ''لائٹ'' شائع کیا، اس کے بند ہوتے ہی ''بوم کلب'' کا قیام عمل میں آیا، مگر کسی نے کوئی پروا نہیں کی کہ اس کا انجام کیا ہوگا، گویا اس ناول میں شکست خواب کا عنصر غالب ہے۔

اس ناول کے اختتام پر پہنچ کر یہی کہنا پڑتا ہے کہ ملک میں بہت سے حق دار کو حق

نہیں مل پاتا ہے تو بالآخر وہ بیرون ملک کا سفر کرتے ہیں، اس ناول کا مرکزی کردار محفوظ ہے، جس کے اندر بے پناہ صلاحیت ہے، منطق وفلسفہ کا آدمی ہونے کے باوجود ادب میں بھی اپنی مثال آپ ہے، یہی وجہ تھی کہ زینہ نامی ریسرچ اسکالر اس کی ادبی صلاحیت کا اعتراف کرتی ہوئی کہتی ہے کہ کاش آپ ہی میرے گائڈ ہوتے، صرف یہیں تک بس نہیں بلکہ وہ محفوظ کی طرف اس طرح مائل ہوئی کہ محفوظ کو بھی کوئی چارہ نظر نہیں آیا اور دونو ں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے، خلاصہ یہ ہے کہ محفوظ بھی ذہین تھا، یادداشت ایسی کہ سنتے ہی پوری پوری غزل یاد ہو جائے، مگر اسے وہ مقام نہیں مل پارہا تھا، جو اس کے لائق تھا، ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ اسے ملک میں ہی وہ تمام سہولتیں دستیاب ہوتیں کہ وہ باہر ملک جانے کا خواب بھی نہ دیکھے، مگر حالات ہی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ پروف ریڈنگ تک کی نوبت آ گئی، چنانچہ وہ بھی دل برداشتہ ملک چھوڑ کر بیرون ملک چلا جاتا ہے، گویا اس طرح ایک اعلی ذہن دوسرے ملک کے کام آتا ہے۔

مجموعی اعتبار سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ ناول ''فسوں'' اپنے آپ میں ایک بڑا ناول ہو تو ہو، مگر ان کے دگر ناولوں کی طرح میرے نزدیک اہم نہیں ہے، کیونکہ بیانیہ انداز اس میں مجروح ہوتا نظر آتا ہے، وسیع کینوس پر محیط ہونے کے باوجود اس کا دائرہ سمٹ گیا ہے، مگر جب بھی عمومی فضا قائم ہوتی ہے تو غضنفر کا اپنا رنگ وآہنگ، ان کی انفرادیت وخصوصیت، ان کا توانا لب ولہجہ اور تخیل قاری کو اپنے حصار میں قید کر لیتا ہے، اس طرح قاری درد وکسک میں ڈوب کر بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے، البتہ ایسی کیفیت اس ناول میں کہیں کہیں ہی نظر آتی ہے۔

مم کا استعارہ

ناول ''مم'' اپنے انداز کا ایک انوکھا ناول ہے، جس کے مطالعہ کے بعد عقل اپیل کرتی ہے، ذہن میں بے شمار سوالات اٹھتے ہیں، ساتھ ہی یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ عوام انسانی بنیادی ضرورتوں کے فقدان کی وجہ سے پریشان ہیں، اس پریشانی کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے لوگوں کا قبضہ ہے، جو انسانی درد سے آشنا نہیں، ان کے ذہن ودماغ انسانیت کے تئیں مفلوج ہو گئے ہیں، انسانی ہمدردی کا انہیں احساس تک نہیں۔

اس ناول کی کہانی کی شروعات سفر کے واقعہ سے ہوتی ہے، وہ اس طرح کہ کہانی کا مرکزی کردار سفر سے آتا ہے اور اس پر غشی طاری ہو جاتی ہے، بیہوشی کی کیفیت ختم ہوتے ہی سفر کے دوران پیش آنے والے مصائب وآلام کا نقشہ آنکھوں میں کھنچ آتا ہے، سفر کی صعوبتوں سے بدن ٹوٹنے لگتا ہے، سفر کی شروعات دراصل پانی کی تلاش کے لئے ہوتی ہے، بے نظیر پانی کی تلاش میں در بدر کا چکر کاٹتا ہے، تالاب کے پاس جاتا ہے، جہاں پیاسے لوگ پہلے سے ہی موجود ہیں، وہ پانی اس لئے حاصل نہیں کر پاتے ہیں کہ اس پر نہنگوں کا قبضہ ہے، بے نظیر تمام تر ہمت جٹا کر نہنگوں پر حملہ کرتا ہے، جس سے نہنگ بھاگ تو جاتے ہیں، مگر تالاب کا پانی زہر آلود کر دیتے ہیں، اس زہر کو ختم کرنے کے لئے کوہ زہر مہرہ کاٹ کر لانے کی ضرورت ہوتی ہے، چنانچہ بے نظیر دشوار گزار راستے کا سفر کر کے زہر مہرہ بھی کاٹ لاتا ہے، مگر تالاب پھر دیوار کے

حصار میں کردئے جانے کی وجہ سے شدتِ پیاس در بدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور کردیتی ہے، دارالتحقیقات جاتا ہے، وہاں بھی پیاس نہیں بجھتی ہے، اس کے بعد خدا کی یاد میں مشغول لوگوں کے پاس جاتا ہے کہ وہ پیاس بجھانے کی کوئی تدبیر بتائیں گے، مگر وہ بھی ذکر واذکار میں پھانس کر بنیادی ضرورتوں سے بہکانے کی کوشش کرتے ہیں، ہر جگہ سے جب وہ مایوس ہوجاتا ہے تو اپنے ذہن ودماغ پر زور ڈال کر غورو فکر کرتا ہے، اسی غوروفکر کے نتیجے میں اسے پانی مل گیا، اس طرح وہ بھی سیراب ہوتا ہے اوراس کے ساتھ ساتھ دیگر لوگ بھی سیراب ہوتے ہیں۔

غضنفر کے سب سے پہلے ناول ''پانی'' اور ''مم'' میں مماثلت ہے، یہ دونوں انسانی بنیادی ضرورتوں کا استعارہ ہے، انسان کی پیدائش کے بعد جو بول منہ سے نکلتا ہے وہ دراصل ''مم'' ہے، یعنی پانی۔ ظاہر ہے پانی کے بغیر بنی نوع انسان کی بقا ممکن نہیں، پانی خود انسانی زندگی کے لئے ازحد لازم وضروری ہے، پھر لوازمات زندگی کو پانی کے استعارے کے طور پر بھی دیکھا جاسکتا ہے، گویا پانی کے بغیر زندگی کی بقا نہیں ہے، اسی طرح لوازمات زندگی کے بغیر بھی، لہذا زندگی کے لئے پانی اور ضروریات زندگی کی حاجت ہے، بےنظیر کے پردے میں ناول نگار نے پوری دنیا کو دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عام انسان ضروریات زندگی کے حصول کے لئے دربدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر ہر جگہ مایوسی ہوتی ہے، اس کی ضرورتیں پوری نہیں ہو پارہی ہیں، ہر جگہ اسے لالی پاپ دے کر بہلا دیا جاتا ہے، ناول ''پانی'' میں بھی یہی احساس غالب ہے، مگر ''مم'' میں یہ معاملہ تھوڑا وسیع ہوجاتا ہے، یعنی بےنظیر ہر جگہ سے مایوس لوٹنے کے بعد سوچتا ہے، غوروفکر کرتا ہے، دماغ کھپاتا ہے، اس لئے ناول ''مم'' میں اسے پانی مل جاتا ہے، سوچ وفکر کی اہمیت وافادیت اجاگر کرکے ناول نگار نے قارئین کو شاید یہ پیغام بھی دیا ہے کہ غوروخوض ایک ایسا ہتھیار ہے، جس کے سہارے بہت کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے

، پانی نہ ملنے یا بنیادی ضرورتوں کے پوری نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ انسان نے غور وفکر کرنا چھوڑ دیا ہے۔

"پانی اس لئے نہیں ملا
کہ تونے دیکھا نہیں
پانی اس لئے نہیں ملا
کہ تونے سوچا نہیں
پانی اس لئے نہیں ملا
کہ تونے سمجھا نہیں
اندرون سے نکلی ہوئی
پراسرار آواز سے
تمام جسم میں سرسراہٹ دوڑ گئی
رگ وپے میں ارتعاش پھیل گیا"
(صفحہ:46)

ناول انسان کو اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے کہ اس کے اندر سوچنے کی قوت ہے، غورو فکر کی لیاقت ہے، دیکھنے کی صلاحیت ہے، اس لئے وہ بصیرت کا مظاہرہ کر کے اپنی ان صلاحیتوں سے کام لے سکتا ہے، مگر آج انسان نے ان سے کام لینا چھوڑ دیا ہے، جس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ وہ بنیادی ضرورتوں سے بھی محروم ہو گیا ہے، اگر انسان آج بھی اپنے ذہن ودماغ پر زور ڈالنے لگے تو بہت سی مشکلیں آسان ہو جائیں گی ، جیسا کہ اس ناول کے مطالعہ سے بھی اندازہ ہوتا ہے، ناول نگار کچھ اس طرح غور وفکر کی دعوت دیتے نظر آتے ہیں۔

"دیکھ
کہ تجھے نظر بخشی گئی

سوچ

کہ تجھے عقل دی گئی

سمجھ

کہ تجھے فہم عطا کی گئی

دیکھ

کہ دیکھنا ریاضت ہے

دیکھ

کہ دیکھنا فراست ہے

دیکھ

کہ دیکھنا کرامت ہے

دیکھ

کہ دیکھنا رموز حیات ہے"

....

سوچ

کہ سوچنا مشیت ہے

سوچ

کہ سوچنا نبوت ہے

سوچ

کہ سوچنا ولایت ہے

سوچ

کہ سوچ ایک صحیفہ ہے

سوچ

کہ سوچ ایک بھگوت گیتا ہے

سوچ

کہ وید و قرآن ہے

(صفحہ:58)

زبان و بیان، منظر نگاری اور مکالمہ کے تعلق سے ناول پانی کا جو معیار و مقام ہے، وہی اس ناول ''مم'' کا بھی ہے، مگر دونوں میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ''مم'' میں اسلوب تخاطب کا ہے، یعنی مخاطب کر کے قارئین کو سوچنے پر مجبور کیا جاتا ہے، اس طرح ایک ایک جملہ میں بہت کچھ سمونے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''مم'' میں بے نظیر کو پانی مل جاتا ہے، اس طرح اس کا اختتام داستانوی اختتام سے جا ملتا ہے، مگر پانی میں انتہائی تگ و دو کے بعد بھی پانی نہیں مل پاتا ہے، اس میں غور و فکر کی اہمیت اجاگر کی گئی ہے، مگر پانی میں یہ عنصر نہیں ہے۔

حیرت فروش کی کہانیاں

حیرت فروش پڑھ کر بڑی حیرت ہوئی غضنفر کی فنکاری پر____ کہ وہ کیسے افسانہ کو ناول اور ناول کو افسانہ بنا دیتے ہیں۔

غضنفر عہد حاضر کے ممتاز ناول اور افسانہ نگار ہیں۔ بیانیہ اسلوب کی دلکشی، گٹھے جملوں کی رعنائی، پلاٹ کی برنائی، مکالمہ کی شگفتگی، کہانی گڑھنے کی ہنرمندی، دلآویز منظر نگاری، نازک خیالی و معنی آفرینی، فکشن کے نشیب و فراز سے آگہی اور سب سے بڑھ کر معاشرتی مسائل پر خامہ فرسائی، ادبی افق پر انہیں جو مقام عطا کرتی ہے، وہ دیگر فنکاروں کو نصیب کہاں۔

'حیرت فروش' غضنفر کا افسانوی مجموعہ ہے، جس میں 33 افسانے ہیں، ان افسانوں کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ انہوں نے کسی خاص میدان میں اپنے قلمی ریس کے گھوڑے نہیں دوڑائے، بلکہ معاشرہ کے سلگتے مختلف موضوعات کو اپنے افسانوں میں سمونے کی کوشش کی ہے، عمومی طور پر انسانی قدروں کی پامالی، فرقہ ستی کی بیخ کنی، حکومتوں کی چالبازی اور معاشرہ کے دبے کچلے افراد کی کہانی ان کے افسانے کے بنیادی موضوعات ہوتے ہیں، اس مجموعہ کی تمام کہانیاں انہیں موضوعات پر گردش کرتی نظر آتی ہیں، چند علامتی کہانیاں بھی اس میں شامل ہیں۔

غضنفر کے بعض علامتی افسانوں کی خوبی یا خامی یہ ہے کہ علامت اتنی دور کی یا گنجلک ہوتی ہے، جو عام قاری کی سمجھ سے بالاتری کا مسئلہ بن جاتی ہے، اگر اس اعتراض پر یہ کہا جائے کہ ان علامتوں سے کہانی کو آگے بڑھانا فنکاری ہے تو معذرت کے ساتھ ایسی فنکاری کا کیا مول جو زود فہم اور صاحب علم کو لذت دے، ان کے ذہن ودماغ کو تو اپیل کرے، مگر متوسط پڑھے لکھے لوگوں کے ذہن پر بار بن جائے، یہی وجہ ہوتی ہے کہ فنکار اپنے قارئین کا دائرہ محدود کر لیتا ہے۔

عمومی فضا میں یہ تذکرہ تو غیر مناسب ضرور ہے، مگر میری نگاہ میں نہیں کہ اس مجموعہ کے کوئی تین افسانہ ''کڑوا تیل، اس نے کیا دیکھا اور جنگل'' کئی ایک متوسط پڑھے لکھے اور فنکشن سے قدرے قریب لوگوں کو پڑھنے دیا، تا کہ وہ کچھ سمجھ کر مجھے سمجھائیں، مگر انہوں نے جو سمجھایا اس سے اور بھی میں الجھ گیا، کہاں ان کی گفتگو اور کہاں یہ افسانے، زمین وآسمان کا فرق! خوشی ہوئی یہ سوچ کر کہ کڑوا تیل ان کے سمجھانے سے پہلے ہی میں نے اچھا سمجھ لیا تھا۔

اکا دکا افسانہ کو چھوڑ کر اس مجموعہ میں شامل تمام افسانوں نے مجھے متاثر کیا ہے، بالخصوص ''مسنگ مین، کڑوا تیل، پرزہ، خالد کا ختنہ، تیشہ، میت، ملبے پر کھڑی عمارت، دراور دیواریں، تیزابی محبت اور ناول کہانی انکل سے ماخوذ تمام افسانے'' میرے ذہن و دماغ کے ساتھ ساتھ پورے معاشرہ کو اپیل کرنے والے ہیں۔

چھ صفحات پر مشتمل کہانی 'کڑوا تیل' میں ہی علامتی انداز سے غضنفر نے انسانی قدروں کی پامالی کا جو نقشہ کھینچا ہے، وہ اپنے آپ میں اعلیٰ فنکاری ہے، انہوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ عام لوگوں کو آج کولہو کا بیل سمجھا جانے لگا ہے، جس طرح کولہو کے بیل کو جکڑ کر پورے دن کام لیا جاتا ہے، بالکل اسی طرح آج حد بندیوں میں قید کر کے عام لوگوں سے کام لیا جانے لگا ہے، ان سے آزادی چھین لی گئی ہے،

بیل کے منہ پر جس طرح جاب اور آنکھوں پر پٹیاں باندھ دی جاتی ہیں، اسی طرح آج حکومت اور سرمایہ داروں یا کارپوریٹ گھرانوں نے غریبوں اور مفلوک الحال لوگوں کے منہ اور آنکھوں پر پٹی باندھ دی ہے، تاکہ وہ اسی طرح اپنے کام میں منہمک رہیں، جس طرح بیل مشغول رہتا ہے۔

> ''ویسے ایک بچھڑے کو تیار کر رہا ہوں، کبھی کبھی اسے جوتتا ہوں، مگر پٹھا ابھی پٹھے پر ہاتھ رکھنے نہیں دیتا، کندھے پر جوار کھتے وقت بہت ادھم مچاتا ہے، آنکھ پر آسانی سے پٹی بھی باندھنے نہیں دیتا، سر جھٹکتا ہے مگر دھیرے دھیرے قابو میں آہی جائے گا'' (صفحہ:20)

اس پیراگراف سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ جتنے لوگ کولہو کے بیل بن کر بغیر چوں چرا کام کر رہے ہیں، اتنے سے آج کے گدی نشیں مطمئن نہیں ہیں، بلکہ مزید لوگوں کو بھی آہستہ آہستہ کولہو میں جوتنا چاہ رہے ہیں۔ شاہ جی کے کولہو پر جو فرد تیل نکلوانے جاتا ہے اور اپنی باری کے انتظار تک شاہ جی سے بات کرتا ہے وہ دراصل ایک فنکار ہے، جو کولہو اور بیل کے حالات کے تناظر میں انسانی زندگی کا باریکی سے مطالعہ کر رہا ہے، وہ چاہتا ہے کہ جبر واستحصال کے پنجوں سے انسان کو آزاد کرا دے، مگر وہ سوچنے کے علاوہ کچھ نہیں کر پا رہا ہے۔

افسانہ نگار نے اس کہانی میں جس درد و کرب کو پیش کیا ہے، وہ پوری دنیا کا درد ہے، عالمی منظر نامہ کی عکاسی ہے، اسی لئے یہ مختصر افسانہ، مختصر نہیں بلکہ انتہائی دلچسپ اور بڑا افسانہ بن جاتا ہے۔

''منگ مین'' بھی انتہائی دلچسپ افسانہ ہے، جس میں والدین اور بچوں کے تعلق سے غضنفر نے پرانی قدروں اور جدید ذہنیت کو سمونے کی کوشش کی ہے، اس میں انہوں نے یہ دکھایا ہے کہ ایک فرد اپنے منشا کے مطابق بچپن گزارنے کی کوشش کرتا ہے، مگر وہ

کامیاب نہیں ہو پاتا ہے، کیوں کہ ہمیشہ اس کے والد سامنے آجاتے تھے اور اس کی خواہش وفرمائش پر اپنے رعب یا تجربہ کا تیشہ چلادیتے تھے، یہی وجہ ہے کہ اس کی ایک بھی نہیں چل پاتی ہے، اس نے جس کلر اور کمپنی کی سائیکل کی خواہش ظاہر کی، وہ نہیں آئی، جس ادارہ میں حصول تعلیم کا ارادہ کیا، وہاں داخلہ کے لئے نہیں جانے دیا گیا، جب یہی فرد بڑا ہوا، اہل وعیال کی کفالت کرنے لگا، مکان خریدنے میں لاکھوں جتن کیے، اپنی خواہشات کو دبایا، ضروریات کا گلہ گھونٹا، اپنے راحت وآرام کو تج کیا، تب کہیں جاکر خریدے گئے گھر پر پتائی کی نوبت آئی، پتائی کے رنگ پر بیٹے نے مخالفت کی کہ پاپا یہ رنگ اچھا نہیں، بیٹی نے بھی بھائی کی ہاں میں ہاں ملائی،، بھائی بہن اڑ گئے کہ رنگ خوش رنگ نہیں ہے، باپ کے ذہن میں اپنے باپ کی یادیں کودنے لگیں کہ بیوی نے کہا کہ بچوں کی بات کیوں نہیں مان لیتے، کہیں اس معاملہ کی وجہ سے ان کی تعلیم متاثر نہ ہوجائے، غضنفر نے یہ دکھانے کی کوشش کی کہ کتنی جلدی قدریں بدل جاتی ہیں، ایک ہی فرد "مسنگ مین" نے دونوں زمانے دیکھے ہیں، ایک زمانہ میں وہ اپنے والد کا طابع تھا تو دوسرے میں اپنے بچوں کا، گویا دونوں جگہ اس کی کوئی اہمیت نہیں۔

> "میں مایوس اور اداس ہوکر اپنے بچپن سے باہر نکل آیا، پھر وہیں آگیا جہاں میں خود ابا بنا بیٹھا تھا، مگر یہاں بھی ابا والا رنگ مجھ میں نہیں تھا، وہ رنگ تو میرے بچوں کے پاس تھا" (صفحہ: 77)

"پرزہ" بھی ایک علامتی کہانی ہے، جو دراصل سماج اور سرکاری محکمات کے احوال وکوائف کی آئینہ دار ہے۔ عمومی طور پر اس کہانی کی دو باتیں قارئین کو اپنے حصار میں قید کرلیتی ہیں۔ اولاً، یہ دکھایا گیا ہے کہ کسی گاڑی کا کوئی پرزہ یا پارٹ اپنی جگہ سے ہل جائے / خراب ہوجائے تو گاڑی ڈس بیلنس ہونے لگتی ہے، توازن بگڑنے لگتا ہے، انتہائی ناپسندیدہ آواز سے بدن کی کیفیت بدلنے لگتی ہے۔ اسی طرح اگر معاشرہ کے

کسی طبقہ کو کمزور کر دیا جائے ، اس پر عرصہ حیات تنگ ہو، کھل کر جینے کا موقع نہیں مل پائے تو گاڑی کی طرح ہی زندگی کی گاڑی بھی ڈس بیلنس ہو جائے گی ، اس کا توازن بگڑ جائے گا، زندگی پر خوشیوں کی بجائے تلخیوں کا رنگ چڑھنے لگ جائے گا، افسانہ نگار نے دکھانے کی کوشش کی ہے کہ اگر واقعی خوش حال اور پر سکون زندگی گزارنا ہو تو معاشرہ کے ہر طبقہ کو زندگی جینے کے یکساں مواقع ملنا ضروری ہیں۔

اسی طرح اس کہانی کا ایک یہ پہلو بھی حالات حاضرہ سے بالکل ہم آہنگ ہے کہ انصاف پسندوں کو ہر طرف سے دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، ڈی سی پی سنگھ جو اس کہانی کا مرکزی کردار ہے، نے غریبوں سے ہمدردی کی، ان کے مسائل حل کرنے کی کوشش کی، گھر سے بے گھر کئے گئے لوگوں کو دوبارہ بسانے کے لئے غیر جانبدارانہ رپورٹ تیار کر کے اعلیٰ افسران کو بھیج دی، مگر اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا کہ اس کے ہاتھوں میں ٹرانسفر لیٹر تھما دیا گیا کہ اس نے حالات پر قابو پانے کے لئے سمجھ بوجھ کا مظاہرہ نہیں کیا۔

ڈی سی پی سنگھ نے ستائے اور اکھاڑے گئے لوگوں کے کہنے پر جب جائے حادثہ کا معائنہ کیا تو وہاں کے مناظر عجیب تھے ، وہاں انہوں نے یہ بھی دیکھا کہ ایک عورت خوبصورت تو ہے، مگر اس کا رخسار جھلسا ہے، جس سے اس کی خوبصورتی ماند پڑنے لگی ہے، عورت دراصل ملک کی علامت ہے، یعنی ہمارا ملک تو خوبصورت ہے، مگر محکمات کی جانبدارانہ پالیسی اور فرقہ پرست عناصر کی حرکت سے ملک کی خوبصورتی ماند پڑنے لگی ہے۔

''خالد کا ختنہ'' بھی ہندوستانی تناظر میں انتہائی کامیاب افسانہ ہے، اس کے مطالعہ کے بعد سب سے پہلے جو بات سامنے آتی ہے، وہ یہ ہے کہ بچوں کا ذہن صاف وشفاف ہوتا ہے، اس پر نقش ہونے والی باتوں کا اثر دیرپا ہوتا ہے، خالد کے والد نے اپنے بیٹے کو جو کہانی سنائی تھی، وہ ہندو مسلم کشاکش کی آئینہ دار تھی کہ ختنہ کرنے والوں کو

برادران وطن مار ڈالتے ہیں، خالد کا ذہن صاف تھا، اس لئے اس کے ذہن پر یہ بات مرتسم ہوگئی کہ ختنہ کروانا گویا برادران وطن سے خود کو مروانا ہے، اس لئے وہ ختنہ کروانے سے ڈر رہا تھا۔

افسانہ نگار نے گویا یہ پیغام بھی دیا ہے کہ بچوں کو ایسی کہانی سنائی جائے، جو اس کی شخصیت پر مثبت رنگ ڈالے۔ بچوں کی صاف ذہنیت کا اندازہ یہاں بھی ہوتا ہے کہ خالد ختنہ کے لئے کسی بھی قیمت پر تیار نہیں تھا، مگر جب پاکستان والے خالو نے کچھ کہا تو تیار ہوگیا۔

> 'امی میں ختنہ کرانے سے نہیں ڈرتا''
>
> 'تو'
>
> 'ابو! آپ ہی نے تو ایک دن کہا تھا کہ جن کا ختنہ ہوتا ہے بدمعاش انہیں جان سے مار دیتے ہیں'' (صفحہ:71)

''در اور دیواریں' اور 'تیزابی محبت'' یہ دونوں کہانیاں بھی ہندوستانی منظر نامہ میں بہت خوب ہیں، مشترکہ طور پر ان میں ناول نگار نے ہندو مسلم معاشرہ کی منظر کشی کی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے ہیں، مگر فرقہ پرست عناصر کسی مسجد یا مندر پر حملہ کر کے دونوں کو متنفر کر دیتے ہیں، جس کا نتیجہ یہ سامنے آتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھ بیٹھتے ہیں، بچوں کے میل جول پر پابندی عائد کر دیتے ہیں، ان کے صاف وشفاف ذہن پر رنجش و دشمنی کا زنگ لگاتے دیتے ہیں۔

ان میں سے ایک افسانہ یہ دکھاتا ہے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقہ کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتا ہے، دونوں ایک دوسرے کو دشمن سمجھتے ہیں، مگر جب قربت بڑھتی ہے تو اندازہ ہوتا ہے کہ دل کس قدر صاف ہے، ناول نگار نے اس کے ساتھ یہ بھی دکھایا ہے کہ جس کا دل صاف ہوتا ہے وہ بھی وقت ضرورت پڑنے پر دشمنی کا ثبوت دیتا ہے، آخر وجہ کیا

ہے؟ کہانی نگار نے خود واضح کیا ہے کہ برادری کا دباؤ ہی کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ایک فرد کو وہ کچھ کرنا پڑتا ہے، جس کے کرنے پر اس کا دل ذرا بھی مائل نہیں ہوتا ہے۔

''ملبے پر کھڑی عمارت'' میں موجودہ تعلیمی صورتحال پر تنقید ہے، ''عمارت'' میں ''ازم اور تحریک'' پر طنز ہے کہ ابتداً وہ اپنے اصولوں کی وجہ سے زمانہ سے ہم آہنگ ہوتی ہے، مگر زیادہ دن نہیں گزرتے کہ لوگوں کو احساس ہونے لگتا ہے کہ وہ تحریک یا ازم جس سے وہ منسلک ہے، زمانہ کے معیار کے مطابق نہیں ہے، اس لئے سابقہ ازم یا تحریک کو چھوڑ کر دوسری نئی تحریک سے منسلک ہونے کی کوشش کرتے ہیں، گویا پوری زندگی میں ڈھلمل یقینی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اسلئے زندگی سے سکون ختم ہو جاتا ہے۔

''حیرت فروش'' کہانی میں بھی ایک تیکھا درد ہے، وہ اس طرح کہ معاشرہ سے اچھے برے کی تمیز ختم ہو گئی ہے، بڑے سے بڑا گناہ بھی اب کوئی تعجب کی بات نہیں رہ گئی ہے۔

''بن بیاہی عورت ماں بن گئی، 'جرم ثابت ہو جانے کے باوجود مجرم بری ہو گیا'

'قاتل کو انعام سے نوازا گیا'

'کوئی اور دکھاؤ'

'گلابوں پر گیندے کھلے'

'کوئی اور'

'شاخ سے ثمر ٹوٹا زمین پر نہیں گرا'

'اور'

'پانی میں آگ لگ گئی، سائبانوں سے دھوپ برستی ہے، آسمان زمین پر اتر آیا، زمین آسمان پر پہنچ گئی'

'کوئی اور'

عجب ہے آپ، اور اور کی رٹ لگائے جا رہے ہیں، مگر ایک بھی حیرت پر آپ کی آنکھ نہیں پھیلی، پیشانی پر کوئی لکیر نہیں ابھری، کیا یہ حیرتیں آپ کو حیرت انگیز نہیں لگیں؟۔

'حیرتیں، حیرت انگیز نہیں، مجھے تو نہیں لگیں'۔ (صفحہ:50)

بات دراصل یہ تھی کہ ایک ادارۂ حیرت کو حیرت میں ڈال دینے والی چیزوں کی ضرورت تھی، اس نے ایسی چیز لانے والوں کے لئے منہ مانگے انعام کا اعلان بھی کیا تھا، حیرت فروش بھی معاشرہ کی بے شمار بری باتوں کو یہ سوچتے ہوئے لے کر پہنچے کہ واقعی یہ حیرت کی باتیں ہیں، مگر ان کی فہرست کی کوئی بات حیرت میں ڈالنے والی نہیں نکلی، اس کے باوجود بھی حیرت فروش مایوس نہیں ہوئے، حیرت کی تلاش میں لگے رہے، مگر اب حیرت فروش کو بھی باپ بیٹی کا زنا، بیٹے کا ماں کے اوپر سوار ہونا، رہبروں کی رہزنی، لنگڑوں کا دوڑنا، زہر کا بے اثر ہونا اور اس طرح کے بے شمار حیرت میں ڈال دینے واقعات حیرتناک نہ لگے، ایک دن کہانی انکل نے تلاش وجستجو کے بعد ادارہ حیرت میں یہ پیش کر دیا ''کسی کی قابلیت اس کے کام آ گئی''۔

اگر انصاف پسندی کے نظریہ سے دیکھا جائے تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ کسی قابل کو اس کی قابلیت کام آجائے، ناول نگار نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ معاشرہ کا آج سب سے بڑا چیلنج یہی ہے کہ حق دار کو حق مل جائے، کیونکہ عدل وانصاف کا جنازہ نکل چکا ہے، عدل گستری کو گہن لگ گیا ہے، ایسے میں کسی قابل کو اس کی قابلیت کام آگئی، یہ حیرت کی بات ہے، گویا یہ احساس ہوا کہ انصاف کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں انصاف کا ٹمٹماتا دیا کسی نہ کسی طرح روشن ہے، مگر جب قابل شخص کو حق دینے والے سے پوچھا گیا تو اس نے صاف کہہ دیا کہ اس قابل شخص کو نوکری اس کی قابلیت کی بنیاد پر نہیں ملی ہے، بلکہ ہم نے اپنی زبان کا مزہ بدلنے کے لئے ایسا کیا ہے، یعنی اس کی قابلیت کام نہیں آئی ہے، یہاں بالکل واضح ہو گیا کہ بڑے سے بڑا جرم بھی حیرت کی بات نہیں ہے، بلکہ اب حیرت کی بات یہ ہے کہ کسی قابل کو اس کی قابلیت کام دے جائے، کسی حقدار کو حق مل جائے، یہ ہے ہمارے معاشرہ کا سچ۔

اس کہانی کے تناظر میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ ناول نگار نے انشائیہ کا اسلوب اپنایا ہے

تو کوئی حرج کی بات نہیں ہے۔

''بھیڑ چال'' کہانی بھی انتہائی دلچسپ ہے، اس میں جنگل ملک کی علامت ہے، بھیڑیں مسلمان ہیں، شیر سے مراد حکومت ہے، سفید بھیڑیں جو شیر کو محبوب ہے، دراصل مسلمانوں کے مسلم نمائندے ہیں، یا یوں کہیئے حکومت کے چٹے بٹے یا مسلمانوں کی آستین کے سانپ۔

کہانی میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے، مسلمان نمبر دو کے شہری ہیں، باہری ہیں ،اس لئے جنگل کے بادشاہ یعنی حکومت کی نگاہ میں مبغوض ہے، مگر چند بھیڑیوں سے حکومت خوش ہے۔

زمانہ انتخابات میں مسلمان بھیڑ کس قدر شیر کے لئے محبوب ہو جاتے ہیں، اگر کوئی مسلمانوں کی طرف نظر اٹھا کر دیکھے تو بہ ظاہر شیر تلملا جاتا ہے اور بھیڑیوں سے کہتا ہے کہ ہم تمہارے ہیں، تمہاری حفاظت کی پوری ذمہ داری میری ہے، گویا ان کی گیدڑ بھبھکی یا دلنواز وعدوں میں مسلم / بھیڑیں ووٹ دے دیتے ہیں، گویا پوری کہانی ہندوستانی سیاست اور مسلمانوں کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔

''سانڈ'' بھی ایک علامتی کہانی ہے۔ سانڈ علامت ہے لفنگے، اوباش، چور اچکوں کی۔ کانجی ہاؤس علامت ہے جیل کی۔

یہ سانڈ بہ ظاہر ہندو بستی سورج پور سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے مسلم محلے میں آکر ادھم مچاتے تھے، غریبوں کو ستاتے تھے، مسلم لڑکیوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے تھے، گاؤں کے افراد کو پریشان کرتے تھے، باشندگان محلّہ نے کانجی ہاؤس میں شکایت کی، مگر ان کی شکایت مسترد کر دی گئی۔ بڑے تھانہ میں بھی شکایت ہوئی، مگر کچھ بھی نہیں ہوا، پھر ردعمل کے طور پر مسلمانوں نے بھی سانڈ تیار کر کے چھٹا چھوڑ دیا کہ وہ ہندو محلّہ میں جائیں اور نقصان پہونچائیں، مگر مسلم سانڈ ہندو سانڈ کے ساتھ مل گئے ان کے ساتھ

ساتھ جا کر غلط سلط حرکتیں کرنے لگے۔

اس کہانی کے پس پردہ کئی ایک کہانیاں ہیں، اولاً تھانہ اور چوکیوں پر طنز ہے، کیونکہ وہاں مسلمانو کی رپورٹ تک درج نہیں کی جاتی ہے، ہر جگہ اس کے معاملے کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے، مگر تھانوں میں مسلمانوں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے، جیسا کہ تھانہ میں گھس کر دیکھنے کے بعد محلّہ کے مسلمانوں کو بھی اندازہ ہوا۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ جو سانڈ ہوتے ہیں، وہ بہ ظاہر ہندو یا مسلم نظر آتے ہیں، مگر ان کا تعلق حکومتی افراد سے ہوتا ہے، اس لئے چوکی والے ایسے سانڈ کی ایف آئی درج کرنے سے کتراتے ہیں، کیونکہ ان کے خلاف شکایت درج کرنے میں نوکری سے ہاتھ دھونے کا بھی خطرہ ہوتا ہے اور کوئی منافع بھی نہیں۔ سانڈ دراصل حکومت کے اشاروں پر ناچتے ہیں اور حکومت ان کے پس پردہ لوگوں سے ہمدردیاں بٹورتی ہے، مسلمانوں نے جو سانڈ تیار کئے تھے وہ بھی ہندو سانڈ کے ساتھ مل کر حکومت کے لئے کام کرنے لگے تھے، گویا اس میں یہ سبق ہے کہ ہندو۔ مسلم انجان ہوتے ہیں، وہ دونوں ایک دوسرے کو کوستے ہیں، اس طرح فرقہ وارانہ فسادات بھڑک اٹھتے ہیں، مذہب اور ذات کے نام پر خون کی ہولی کھیل لی جاتی ہے، مگر مسلمانوں کا قصور ہوتا ہے اور نہ ہی ہندوؤں کا، بلکہ سراسر بالواسطہ حکومت قصوروار ہوتی ہے، وہی ان فسادات کے لئے ذمہ دار ہوتی ہے، کیونکہ ٹھپے لگے سانڈوں کو وہی پالتی ہے۔

''کلہاڑا'' کہانی بھی ہندوستانی تناظر میں ایک کامیاب کہانی ہے، جس میں دراصل آزادیٔ ہند کا تذکرہ ہے، اس میں یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ ہندوستانیوں نے ملک کو سینچا تھا، یعنی کھیتی کی تھی، مگر چتر چالاک انگریزوں نے اس پر قبضہ کرلیا، جب باشندگان ہند نے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کی حکمت عملی شروع کی تو ایک وقت ایسا محسوس ہوا کہ ہندوستان آزاد ہوگیا، یہاں پر 1857 کی جانب اشارہ ہے،

یہ محض خام خیالی تھی کہ ملک آزاد ہو گیا، مگر انتہائی جانفشانی کے بعد 1947 میں ملک آزاد ہوا، سب نے سکون کی سانس لی، اس آزادی کے بعد کچھ یوں ہوا کہ برادران وطن کی نگاہ میں آہستہ آہستہ مسلمان مبغوض ہو گئے۔

کہانی ''اصلاح الوحشیان'' میں طاقت ور اور کمزور ممالک کے تعلق سے اقوام متحدہ کی جانبدارانہ پالیسی کو اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

کہانی ''مٹھائی'' میں ہندوستانی منظر نامے سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ کیسے ہندو مسلم باہم شیر وشکر ہو کر رہتے ہیں، مگر فرقہ پرست عناصر دونوں کے درمیان تلخیاں پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، گائے ملک کی علامت ہے، اس کے دودھ سے ملک کے پورے باشندگان فائدہ اٹھاتے ہیں، مگر ایک موقع آیا کہ دودھ راکشش آکر پی جاتا ہے، ان دونوں گروہ کے لوگوں میں شکوک جنم لینے لگے، وہ دونوں ایک دوسرے کو غلط نگاہ سے دیکھنے لگے کہ شاید اس نے نکالا ہے، مگر دودھ تو راکشش پی لیتا تھا، جو کہ فرقہ پرست ہے اور ہندو مسلمانوں کو باہم لڑانے کے آلہ کار بھی۔

غضنفر کے ناولوں اور افسانوں میں ادب برائے زندگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے ،عریانیت وفحاشی کا احساس کم ہی ہوتا ہے، بے جا عشق وعاشقی جو ادب کا جز ولاینفک بنتا جا رہا ہے، اس سے بھی غضنفر کی تخلیقات پاک ہیں، ورنہ تو عموماً تخلیق کار عشقیہ نغمہ سرائی کر کے قارئین کی واہ واہی لوٹنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، یہی وجہ ہوتی ہے کہ ایسے فنکاروں کے یہاں سوقیانہ پن اور ابتذال کا احساس ہوتا ہے، غضنفر کی تخلیقات میں ایسے مواقع ضرور آتے ہیں، جہاں وہ عشق کی لن ترانیاں سنا سکتے ہیں، جنسی جذبات کو ہوا دے سکتے ہیں، مگر وہ شاید دانستہ اپنا دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

ناول ہو کہ افسانہ، غضنفر اختصار سے اپنی رشتہ داری اچھی طرح نبھاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قارئین کو بھی ان سے رشتہ نبھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، ورنہ آج کی

برق رفتار دنیا میں طول طویل ناول پڑھنا انتہائی مشکل، بلکہ محال امر ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ ان دنوں کوئی پانچ اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل لکھے جانے والا ناول شاید ہی کبھی پڑھا جاتا ہو، لیکن زورِ قلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے فنکار اپنی فنکاری کا لوہا منوانے کے لئے ضخیم ناول اگل دیتے ہیں، ایسے ناول پر انہیں خوشامدی ایوارڈ مل تو جاتے ہیں، مگر قارئین سے کوئی مضبوط رشتہ نہیں قائم ہو پاتا ہے۔

سرخ رو کا سفید رنگ

غضنفر کے مجموعہ ٔخاکہ ''سرخ رو'' اور اس سے منسلک ظفر کمالی کا مضمون پڑھ کر خاکہ کے تعلق سے چند سوالات ذہن و دماغ میں اٹھنے لگتے ہیں، کیا کامیاب خاکہ کے لئے متعلقہ شخصیات کی خامی اور خرابی کو بھی زیر قلم لایا جائے؟ ویسے تو دونوں پہلوؤں کو اجاگر کرنے کا قاعدہ بتایا تو ضرور جاتا ہے، مگر بیشتر خاکوں سے یہ عنصر غائب ہوتا ہے، عام طور سے خوبیوں کو اجاگر کیا جاتا ہے اور کمزور پہلوؤں کو نہیں، البتہ بعض اوقات نہ چاہ کر بھی اس کی معمولی جھلک دکھائی جاتی ہے، لیکن غضنفر کے خاکے مختلف ہیں، ان میں افسانوی فضا بھی ہے اور مکالماتی اسلوب بھی، سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ انہوں نے عام روش سے ہٹ کر صاف کہا ہے کہ میرے خاکوں میں سیاہ رنگ پر سفید رنگ غالب ہے، یعنی میں نے کمزور پہلوؤں سے چشم پوشی کرتے ہوئے خوبیوں کو زیادہ اجاگر کیا ہے:

> ''سفید رنگ کو دکھانے میں بخل سے کام نہیں لیتا بلکہ اس عمل میں کسی حد تک تخیل اور مبالغے کی آمیزش بھی کرتا ہوں، اس لئے کہ ایسا کرنے سے سفیدی کی چمک اور بڑھ جاتی ہے، اس کی رنگینیاں بھی پھوٹ پڑتی ہیں، جن سے دل اور دماغ رنگین اور روشن ہوتے ہیں۔

> آج میری نگاہ کے فوکس میں جو آدمی موجود ہے، اس میں بھی مجھے دونوں رنگ دکھائی دے رہے ہیں، مگر میں اپنی فطرت کے مطابق سیاہ رنگ اپنے تک محدود رکھوں گا اور سفید رنگ پوری آب وتاب کے ساتھ آپ کو بھی دکھانے کی کوشش کروں گا'' (سرخ رو: صفحہ: 114)

اس کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خوبی وخامی یا اچھائی و برائی کے بیان کا معیار کیا ہوگا؟ کسی شخصیت کا کوئی پہلو کسی کے لئے برا ہوتو ضروری نہیں وہی دوسروں کے لئے بھی برا ہی ہو، اسی طرح کسی کی کوئی خوبی کسی کو بھلی لگے، ضروری نہیں کہ وہ سب کے لئے بھی بھلی ہو، اس سوال کے تناظر میں اس مجموعہ میں شامل ظفر کمالی کا مضمون انتہائی اہم ہے:

> ''اچھے خاکے کا بنیادی وصف یہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس میں معروضی نقطہ نظر سے کام لیا گیا ہو اور متعلقہ شخصیت کی خوبیوں کے ساتھ اس کی خامیاں بھی اجاگر کی گئی ہوں، اگر صرف خوبیوں پر اکتفا کیا جائے تو وہ خاکہ ایک رخا ہو جائے گا، راقم الحروف کے خیال میں یہ بات جزوی طور پر ہی درست کہی جاسکتی ہے، خاکہ نگار اگر کسی شخصیت پر اپنے ذاتی مشاہدے کی روشنی میں لکھ رہا ہو تو وہ وہی لکھے گا، جو اس نے دیکھا ہے، برا انسان بھی کسی کے لئے اچھا اور اچھے سے اچھا شخص بھی کسی کے لئے برا ہو سکتا ہے''۔ (صفحہ: 12)

کامیاب خاکہ کے تناظر میں ایک بات کچھ یوں بھی سامنے آتی ہے کہ خاکہ نگار کو متعلقہ شخصیت کے بارے میں لکھتے ہوئے ایسا اسلوب اختیار کرنا چاہئے، جس سے قارئین کو یہ احساس نہ ہو کہ خاکہ نگار نے جانبداری سے کام لیا ہے، یعنی انہیں اس طرح اوصاف وکمالات کی قصیدہ خوانی نہیں کرنی چاہئے کہ انسان، انسان نہ رہ جائے اور نہ ہی ایسا ہجویانہ انداز اپنانا چاہئے کہ متعلقہ شخصیت برائیوں کا مجسمہ بن جائے، اسلوب اس طرح غیر جانبدار ہو کہ قارئین خود فیصلہ کرے کہ کیا خامی ہے اور کیا خوبی؟

یہ الگ بات ہے غضنفر کے خاکوں کو انتہائی کامیاب قرار دیا جائے یا نہیں، مگر ان کے خاکوں میں چند پہلو ایسے ہوتے ہیں، جو انہیں دوسروں سے ممتاز کرتے ہیں۔ اول، خوبیوں پر ایسا رنگ چڑھانا جو شخصیت کو انتہائی آب دار بنا دے۔ دوم، افسانوی طرز نگارش۔ سوم، مکالماتی اسلوب۔ چہارم، عناوین کی دلکشی۔

افسانوی خاکوں کی فہرست میں طارق چھتاری پر لکھا گیا خاکہ انتہائی کامیاب ہے ، شروع سے آخر تک افسانوی رنگ غالب نظر آتا ہے، اس خاکہ میں انوکھی منظر نگاری بھی ہے اور چست درست مکالمہ کی چاشنی بھی، خوبصورت تشبیہات واستعارات بھی ہیں تو متعلقہ شخصیت کی ثنا خوانی بھی، یہی وجہ ہے کہ اگر اس خاکہ سے چند جملے نکال دئے جائیں تو افسانہ بھی ہو سکتا ہے، اس کے مطالعہ کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ کوئی فرد کسی سے ملنے گیا اور متعلقہ شخصیت کے عادات وطوار، رفتار و گفتار اور اخلاق و مروت دیکھ کر وہیں لکھنے بیٹھ گیا ہو، افسانوی اسلوب اور منظر کشی وغیرہ کا اندازہ ذیل کے پیراگراف سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔

''پورٹریٹ بنانے کا خیال آتے ہی میں گھر سے باہر نکل پڑا۔
مختلف سمتوں میں مختلف منظروں، مکانوں، تختیوں، چہروں اور سراپوں کو دیکھتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ اچانک ایک نیم پلیٹ نے مجھے روک لیا۔
پروقار دروازے پر نصب سیاہ سنگ مرمر کے منقش پلیٹ پر مختلف رنگوں سے مزین فنکارانہ تحریر نے مجھے اندر داخل ہونے کے لئے بے قرار کر دیا۔ آگے بڑھ کر میں نے کال بیل کا بٹن دبا دیا۔
چند لمحے بعد اندر سے قفل کھلا .... لکیر کے ایک طرف ہرے بھرے کھیت، رنگ برنگ کے پھولوں اور طرح طرح کے پھلوں کے باغات تھے، کھیتوں میں پودے لہلہا رہے تھے، پودوں کے پہلوؤں میں کہیں پر ہری اور کہیں پر سنہری بالیاں جھوم رہی تھیں۔ باغ میں درختوں کی شاخوں پر خوش رنگ پرندے بے

فکری سے چہچہا رہے تھے۔ کھیت اور باغ کے پیچھے کچھ پرانے وضع قطع کے مکانات اور بہت سارے پھوس اور کھپریل کے کچے پکے گھر دکھائی دے رہے تھے''۔(صفحہ:52)

مکالماتی انداز کے خاکے میں علی احمد فاطمی پر لکھے گئے خاکے ''موبائل آدمی'' کو رکھا جاسکتا ہے، یہ وہ خاکہ ہے، جس میں خاکوں کے عناصر ترکیبی کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، خاکہ لکھتے وقت یہ بات بھی پیش نظر رکھنی ضروری ہے کہ متعلقہ شخصیت خاکہ کے منظر سے غائب نہ ہو، فاطمی صاحب مکمل آب وتاب کے ساتھ پورے خاکہ میں موجود رہتے ہیں، اس میں مکالماتی اسلوب بھی ہے، جو مزید دلکشی بڑھا دیتا ہے۔

''پڑھنا، پڑھانا، لکھنا، لکھوانا، لکھوا کر پڑھوانا، محفلیں سجانا، سمینار اور کانفرنسوں میں شرکت کے لئے آج دہلی تو کل ممبئی اور پرسوں اودے پور میں ہونا، ایک ادبی رسالہ نکالنا، اپنے نظریاتی مسلک کا علم ہونا........یہ سارے کام ایک آدمی بڑی آسانی، خوش اسلوبی، مستعدی، دل جمعی اور جواں مردی سے کرتا ہے، یقیناً آپ اس شخص کو جاننا اور اس سے ملنا چاہیں گے ....دبلا پتلا جسم، اوسط قد، گیہواں رنگ، پکی عمر مگر کچا لک، جیسے کوئی جواں سال مرد، پیشانی سے لے کر آدھے سر تک پورا چاند، یہ چاند اس چرخ پر چمک رہا ہے، جس کے مطلع پر کبھی ایک ایسا مشرقی ماہتاب طلوع ہوا تھا، جس نے مغربی آفتاب کے تابناک چہرے کو اپنے اکبری طنزیہ تیروں سے نہ صرف داغدار کیا بلکہ اسے غروب ہونے پر مجبور بھی کردیا ہے، جی ہاں وہ آدمی الہ آباد سے ہے، مگر الہ آباد میں صرف وہی ایک ایسا آدمی نہیں، جس کا تعلق ادب سے ہے.....آپ دیکھیں تو آپ کے سامنے صرف ایک ہی چہرہ اور اپنے سفر کی روداد کو ''سفر بے شرط'' کے عنوان سے قلم بند بھی کیا ہے۔

''فاطمی''

جی آپ نے بالکل صحیح پہچانا''۔(صفحہ:81)

اس خاکہ میں فاطمی کا پورا نقشہ آگیا ہے، غضنفر سے ان کی جو نزدیکیاں اور قربتیں ہیں، وہ اپنی موجودگی درج کرواتی ہیں۔ یوں تو ان کے بیشتر خاکوں میں مکالمہ موجود ہے، جو دیگر خاکہ نگاروں کے یہاں نہیں ملتا ہے، ''ابوالکلام قاسمی: بیسوی صدی سے آگے کا آدمی'' میں مکالمہ کچھ یوں ہے:

''خورشید بھائی، آپ تو ضرور ٹاپ کریں گے؟
نہیں، میری کلاس میں ایک ایسا لڑکا ہے جو ''بیسویں صدی'' میں چھپتا ہے
''۔(صفحہ 114)

''عمل ہوش ربائی'' جو نسیم احمد کا خاکہ ہے، میں مکالمہ کچھ یوں ہے:

''میں نسیم ہوں'' چور کی جگہ پوتے کو دیکھ کر ان کی گھبراہٹ تو دور ہو گئی مگر حیرانی جیوں کے تیوں بنی رہی۔

'اس وقت؟ ادھر سے؟'

''تہجد پڑھ کر آرہا ہوں، دروازہ بند ہو گیا تھا اس لئے ادھر سے....'' شدید غصے کے باوجود دادا نماز تہجد سے مقابلہ نہ کر سکے۔(صفحہ:65)

خالد محمود پر لکھے گئے خاکے میں بھی مکالمہ اس انداز سے ہے:

''دوسرے صاحب جس سے میں مخاطب تھا، جھٹ سے بول پڑے'

'یہ سنتے ہی میرے چہرے کا رنگ بدل گیا، گفتگو کا سلسلہ رک گیا، تیسرے آدمی کا چہرہ میری آنکھوں میں یک بارگی آن بسا اور چہرے پر سے چہرہ اترنے اور اس پر چہرہ چڑھنے کا سلسلہ شروع ہو گا'

'آپ یوں اچانک رک کیوں گئے، یہ آپ کے چہرے کو کیا ہو گیا'

ان کے سوال کے جواب میں میں بولا:

'جناب! جس شخص کو آپ نے ایک چہرہ کا آدمی بتایا، میرے نزدیک وہ کئی چہروں والا آدمی ہے'۔ (صفحہ:89)

زیرِ نظر مجموعہ میں لفظوں کے برتنے کا ایسا کھیل کھیلا گیا ہے کہ زبان شگفتہ ہوگئی ہے ، ہر جملہ سے شستگی کا احساس ہوتا ہے، بندش الفاظ کی اداذہن و دماغ میں رس گھولتی ہے ، شخصیتیں سفید رنگ کی سادگی سے ایسی پرکشش ہو جاتی ہیں کہ ہر اک دل میں ان کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے، ان کے دیدار کا اشتیاق پیدا ہوتا ہے، البتہ بعض مقامات پر اگر سفیدی کا پردہ ہٹا کر سیاہ رنگ دکھانی کی کوشش کی گئی ہے تو بھی اس وقت خاکہ نگار کا اسلوب دلکش ہو جاتا ہے، خامی ایسے سامنے آتی ہے کہ متعلقہ شخصیت کے دوسرے دیوانوں کے لئے خفگی کا سبب نہیں بنتی ہے۔

ان تمام خصوصیات کے بعد اس مجموعہ کے عناوین بھی انتہائی دلچسپ ہیں، پرکشش ہیں، موزوں اور شخصیت سے بالکل قریب تر ہیں، ''نارنگ کے نورنگ'' اس میں جتنی کشش ہے اتنی ہی مضمون سے ہم آہنگی بھی، کیوں کہ خاکہ نگار نارنگ پر نورنگ کچھ اس طرح چڑھاتے ہیں کہ وہ کبھی علم و عمل کے پیکر نظر آتے ہیں تو کبھی محسن و مربی، کبھی سادگی اور پاکیزگی کا مجسمہ نظر آتے ہیں تو کبھی ایسے بارعب کہ کوئی ان کے سامنے لب کشائی نہ کر سکے۔ ''موبائل آدمی'' یہ کچھ ایسا عنوان ہے، جس میں تیزی و پھرتی اور مشینی کیفیت کا احساس ہوتا ہے، علی احمد فاطمی، جن کے خاکے سے پتا چلا کہ وہ انتہائی سرگرم ہیں، کسی منزل پر ٹھہر کر بس ٹھہر جانا ان کا مذہب نہیں ہے، وہ تو ہمیشہ چلتے، پھرتے ہیں، اپنے کام میں لگے رہتے ہیں، دھن کے پکے ہیں، قول کے سچے ہیں، ہمیشہ کچھ کرتے رہنے میں یقین رکھتے ہیں، ایسے شخص کو موبائل سے تشبیہ دے کر خاکہ نگار نے اور بھی پھرتیلا اور بے خوف و خطر اپنے کام سے سروکار رکھنے والا ثابت کر دیا

ہے۔ ’’ایک چہرے کا آدمی‘‘ جو خالد محمود کا خاکہ ہے، اس عنوان میں دلکشی سے زیادہ معنویت ہے، آج کے دور میں ایک چہرہ کا آدمی ہونا ایک بڑا وصف ہے، کیوں کہ قدم قدم پر لمحہ لمحہ آدمی کا چہرہ بدل جاتا ہے، سامنے کچھ ہوتا ہے اور پیٹھ پیچھے کچھ اور، ایسے میں ایک آدمی کا ایک چہرہ کا آدمی ہونا بڑی بات ہے، اس طرح ’’عمل ہوش ربائی، عشق کا آدمی، اندر سے اُگا آدمی، بیسوی صدی سے آگے کا آدمی‘‘ بھی ایسے عناوین ہیں جو دلکش ہیں اور شخصیت کے لیے مناسب اور انتہائی موزوں بھی، معنویت ایسی کہ خاکے پڑھنے کے بعد ہی احساس ہو۔

اختتامیہ

غضنفر ایک ایسے فنکار یا فکشن نگار ہیں، جو کئی معنوں میں معاصرین اور قدما تخلیق کاروں سے ممتاز ہیں، وہ اگر زودنویس ہیں تو تجربہ کار بھی، انہیں لفظوں سے کھیلنا آتا ہے تو لفاظی سے اجتناب کرنا بھی، انسانی جبر کے خلاف قلم کو حرکت دیتے ہیں تو اس کے حل کی طرف ذومعنی اشارہ بھی کرتے ہیں۔

انہوں نے اب تک 9 ناول لکھے ہیں، یہ تمام ناول موضوعات کے اعتبار سے مختلف ہیں اور زبان وبیان کے لحاظ سے بھی۔ ''مانجھی'' جس میں انہوں نے بہت کچھ سمویا ہے، مگر مرکزی خیال ہندو مسلم اتحاد ہے، کیوں کہ انہوں نے گنگا جمنا کے سنگم سے اتحاد و اتفاق کا پیغام دیا ہے کہ دونوں رواں دواں ہیں، ایک ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں ،کوئی نوک جھوک نہیں ہے، کوئی الجھاؤ نہیں، اس طرح ہی ملکی باشندگان کو بھی رہنا چاہئے، باہم شیر وشکر ہو کر۔ ''شوراب'' جس کا کینوس انتہائی وسیع ہے، مرکزی خیال یہی ہے کہ ملک میں حق داروں کو اگر حق نہیں ملتا ہے تو وہ بادل نخواستہ بیرون ممالک چلے جاتے ہیں، جن کے جانے سے بہت سے توجہ طلب مسائل بھی پیدا ہوتے ہیں۔ ''کینچلی'' میں عشق بلکہ سچی اور پاکیزہ محبت کی ایسی دلخراش داستان ہے، جو مذہبی حد بندیوں کے سامنے آکر دعوت فکر دیتی ہے۔ ''دیویہ بانی، وش منتھن'' میں معاشرتی، مذہبی اور طبقاتی کشمکش کو سپرد قلم کیا اور ان کی قباحتوں کو اجاگر کر کے حل پیش کرنے کی

طرف بھی اشارے کیے گیے ہیں۔ ''مم اور پانی'' میں علامتی طور پر انسان کی بنیادی ضرورتوں کے حصول کے لئے آنے والی دقتوں اور پریشانیوں سے پردہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے، نیز یہ بھی دکھایا گیا ہے کہ گدی نشیں کیسے مگر مچھ کی طرح کمزوروں کو نشانہ بنائے ہوئے ہیں۔ ''کہانی انکل'' کا مرکزی خیال یہی ہے کہ انسانی جبر سے انسانوں کو آزاد کرانا کسی ایک کے بس میں نہیں، اس کے لئے بڑی تعداد میں لوگوں کو تیار کرنا ضروری ہے۔ رہی بات ''فسوں'' کی تو اس کا مرکزی خیال شکست خواب کا نظارہ ہے۔ اگر بنیادی طور پر ان کے تمام ناولوں کے مرکزی خیال کا احاطہ کریں تو اس کے سوا کچھ اور نہیں ہوگا کہ انسانی جبر سے انسان کو آزاد کرانا ہی ناول نگار کا ہدف ہے، انسانی جبر کا کھیل حکومت کھیلے، فرقہ پرست عناصر کھیلیں، گدی نشیں کھیلیں، تعلیم گاہوں کے ٹھیکیدار کھیلیں، سب برابر ہیں۔ ان تمام کے جبر سے لوگوں کو آزاد کرانے کے لئے دراصل ناول نگار نے محاذ آرائی کی ہے، غلط رسومات کی بیخ کنی کی ہے، غضنفر کی تخلیقات کے مطالعہ سے قاری یہاں تک پہنچتا ہے کہ وہ ایک ایسے فنکار ہیں، جن کی تخلیق ذرا ایک سے ہٹی ہوئی ہوتی ہے، باوجود اس کے ان کے مواد، مکالمہ اور منظر نگاری میں عجب سی لذت ہوتی ہے، تازگی ہوتی ہے، شگفتگی کا احساس ہوتا ہے، ان کی یہی کوشش ہوتی ہے کہ ان کی دوسری تخلیق پہلی تخلیق سے یکسر ممتاز ہو، اس میں نیا پن اور رعنائی ہو، یہی وجہ ہے کہ وہ تجربات سے کبھی جھجکتے نہیں، شاید تجربات کا ہی نتیجہ ہوتا ہے کہ ان کا ادبی ماحول تھوڑا پیچیدہ اور غیر روایتی ہوتا ہے، غضنفر نئے تجربات کے بارے میں خود کہتے ہیں:

> ''میری کوشش ہوتی ہے کہ ہر ناول میں ایک نئی اور تجرباتی زمین تلاش کروں، ناول لکھتے وقت مجھے ہمیشہ یاد رہتا ہے کہ یہ لفظ ''ناویلا'' سے نکلا ہے، جس کا مطلب ''کچھ نیا'' ہوتا ہے، مجھے قصہ گوئی کی وہ روایت کبھی پسند نہیں آتی جس میں ساری باتیں کھلے طور پر سامنے کہہ دی جاتی ہیں، مجھے راست بیانیہ پسند نہیں ہے، اس لئے میں نے اپنی تخلیقات کو تہہ در تہہ

بننے کی کوشش کی، میرے خیال سے تخلیق میں کچھ ایسا چاہئے جو چھپا ہوا ہو، معنوی گہرائی کے بغیر تخلیق کی دیرپا اہمیت نہیں ہوتی، عظیم ادیبوں کی تخلیقات کو جب بھی ہم پڑھتے ہیں ان کی معنویت نئے سرے سے سمجھ میں آنے لگتی ہے، وقت بدلنے کے ساتھ ساتھ اگر تخلیق کو زندگی نو ملتی ہے تو اس کے پیچھے ویسی معنوی تہہ داری اور گہرائی ہوتی ہے، اس لئے میں نے دھیان دے کر اپنے ادب کے ماحول کو تھوڑا پیچیدہ، غیر روایتی اور تجربہ پسند بنانے کی کوشش کی ہے''۔(شعر وحکمت صفحہ:521)

زبان وبیان کی ستھرائی بھی ان کی امتیازی خصوصیات میں سے ایک ہے، وہ زبان پر مکمل عبور رکھتے ہیں، لفظوں کے انتخاب اور انہیں پرونے کے انوکھے انداز سے جملوں کا ایسا گلدستہ بنادیتے ہیں، جو انتہائی دلکش ہوتا ہے، کردار کے لحاظ سے زبان کے استعمال کا ہنر بھی انہیں خوب آتا ہے، مکالمہ اور زبان وبیان کے لحاظ سے ان کے تمام ناولوں کا مقام الگ الگ ہے۔ ''وش منتھن، مانجھی اور دو یہ بانی'' کی زبان الگ ہے، ''فسوں، کہانی انکل اور کینچلی'' کا انداز بیان الگ ہے، اسی طرح ''مم اور پانی'' کی زبان منفرد شگفتگی کا مزہ دیتی ہے، ان کی زبان انتہائی سادہ، شگفتہ، دلکش اور سلیس ہے، مگر ''وش منتھن، دو یہ بانی اور مانجھی'' میں زبان ہندی زدہ ہے، جس کی لذت کچھ اور ہی ہے، ان ناولوں کے کردار بیشتر غیر مسلم ہیں، شاید اس لئے ہندی زدہ اردو کا استعمال دانستہ کیا گیا ہو۔ ''مم اور پانی'' میں ہی زبان پر ان کی گرفت کا صحیح اندازہ ہوتا ہے، کیوں کہ چند صفحات پر ہی زبان بدل جاتی ہے، دار التحقیقات کی زبان الگ ہے، داستانوی فضا میں مقفیٰ اور مسجع عبارتیں ہیں:

''اے جواں سال تشنہ لب، گرفتارِ طلسم تاب وتب، آمرے حلقہ آغوش میں آ، آمرے جسم معطر میں سما، برآئے گی ہر مراد تری، تجھ کو مل جائے گی، اک لال پری، دور ہو جائے گی تھکن ساری، مٹ کے رہ جائے گی بے قراری، مے کشی کا مزہ اٹھائے

گا، تشنگی کا پتا نہ پائے گا، جسم وجاں میں نشہ سمائے گا، چشم سے استعجاب جائے گا۔
''(پانی صفحہ:28)

مقفیٰ و مسجع عبارتوں کے بعد سادہ اور انتہائی سلیس عبارتوں پر ایک نظر ڈالیں:

''مہ لقاؤں نے اپنے مہتابی ہاتھوں کے سہارے ایک ملائم معطر بستر پر لٹا دیا، اس کے لیٹتے ہی کچھ منتخب مہ لقائیں مدارات محبوبانہ میں مصروف ہو گئیں، ان میں سے چار بستر کے چاروں طرف سرخاب کے پروں کا پنکھا لے کر کھڑی ہو گئیں، دو سرہانے بیٹھ کر اس کے بالوں میں اپنی مخروطی انگلیاں پھیرنے لگیں، دو پائنتی کی جانب اس انداز سے بیٹھ گئیں اور ان کے مہ لقاؤں کی ماہتابی انگلیاں رقص کرنے لگیں۔

دو اس کے دونوں پہلوؤں میں لیٹ گئیں اور باقی خواب گاہ سے باہر نکل گئیں، سرخاب کے پروں کی ٹھنڈک __ انگلیوں کے سحر آگیں لمس، سپید مخملی جسموں کی حرارت اور بستر استراحت کی نرماہٹ کی ملی جلی مدہوش کن کیفیت اس کے رگ و پے میں سرایت کرتی گئی اور اس کی پلکیں دھیرے دھیرے بند ہوتی چلی گئیں'' (پانی صفحہ:51)

ان کی ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ راست بیانیہ سے پرہیز کر کے علامتی انداز میں بات کہتے ہیں، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ قارئین کو کھل کر سوچنے کا موقع ملتا ہے، وہ اپنے اپنے انداز میں غور و فکر کرتے ہیں، اپنے اپنے انداز میں ناولوں کا مقام و مرتبہ متعین کرتے ہیں، غضنفر کا یہ بھی کمال ہے کہ نہ صرف وہ مسائل اجاگر کر کے ہنگامہ آرائی کرتے ہیں، بلکہ ان کے حل کے متعلق لطیف اشارے بھی کرتے ہیں، یہ لطیف اشارہ انہیں ترقی پسندوں سے ممتاز بھی کرتا ہے، ایسا بھی نہیں کہ مسائل کا حل پیش کرتے وقت وہ تخلیقی دنیا سے باہر آجاتے ہیں، خلاصہ یہ ہے کہ فکشن کی دنیا میں رہ کر ایسا حل پیش کرتے ہیں، جو قابل قدر ہوتا ہے، نہ کہ پروپگنڈہ۔

غضنفر کے ناولوں میں ادب برائے زندگی کا عنصر ہمیشہ غالب رہتا ہے، عریانیت وفحاشی کا احساس کم ہی ہوتا ہے، بے جا عشق وعاشقی جو آج کل ادب کا جزولاینفک بنتا جارہا ہے، اس سے بھی غضنفر کی تخلیقات پاک ہیں، ورنہ عموماً تخلیق کار عشقیہ نغمہ سرائی کر کے قارئین کی واہ واہی لوٹنے کے خواہشمند ہوتے ہیں، یہی وجہ ہوتی ہے کہ ایسے فنکاروں کے یہاں سوقیانہ پن اور ابتذال کا احساس ہوتا ہے، غضنفر کی تخلیقات میں ایسے مواقع ضرور آتے ہیں، جہاں وہ عشق کی لن ترانیاں سنا سکتے ہیں، جنسی جذبات کو ہوا دے سکتے ہیں، مگر وہ شاید دانستہ اپنا دامن بچا کر نکل جاتے ہیں۔

ناول ہو کہ افسانہ، غضنفر اختصار سے اپنی رشتہ داری اچھی طرح نباہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ قارئین کو بھی ان سے رشتہ داری نبھانے میں کوئی پریشانی نہیں ہوتی، ورنہ تو آج کی برق رفتار دنیا میں طول طویل ناول پڑھنا انتہائی مشکل بلکہ امر محال ہے، مجھے تو لگتا ہے کہ ان دنوں کوئی پانچ اور آٹھ سو صفحات پر مشتمل لکھا جانے والا ناول شاید ہی کبھی پڑھا جاتا ہو، لیکن زور قلم کا مظاہرہ کرتے ہوئے فنکار اپنی فنکاری کا لوہا منوانے کے لئے ضخیم ناول اگل دیتے ہیں، ایسے ناول پر انہیں خوشامدی ایوارڈ مل تو جاتے ہیں، مگر قارئین سے کوئی مضبوط رشتہ نہیں قائم ہو پاتا ہے۔

غضنفر کی ایک بڑی خصوصیت میری نگاہ میں ان کا ''موازنہ'' ہے، وہ اس طور پر کہ غضنفر کسی واقعہ کو بیان کر کے اس کے فوراً بعد کوئی دوسرا ایسا واقعہ بیان کر دیتے ہیں، جس سے قاری کے ذہن میں بہت سی باتیں ابھرنے لگتی ہیں اور شہر و دیہات اور مرد وعورت کی خامی وخرابی ابھر کر سامنے آجاتی ہے، مثلاً غضنفر اپنے ایک افسانہ ''پارکنگ ایریا'' میں شہری رشتہ داروں کی بے رخی دکھاتے ہیں، اس کے فوراً بعد دیہات میں رہنے والے رشتہ داروں کی محبت اور ان کے حسن سلوک کو سامنے رکھ دیتے ہیں، جس سے شہر اور دیہات کی خامی وخرابی واضح طور پر سامنے آجاتی ہے۔ اسی طرح اپنے

ناول ''کینچلی''میں مرد وعورت کی ذہنیت کا موازنہ بڑے حسین انداز میں کرتے ہیں، وہ اس طرح کہ مینا (جو اس ناول کی مرکزی کردار ہے) کے ابو امی دونوں وقفہ وقفہ سے بیمار ہوتے ہیں، ابو کی بیماری کے زمانہ میں تیمارداری کے لئے اسپتال میں بے شمار خوبصورت نرس ان کے پاس ہوتی ہیں، مگر ابو کا دل امی کی طرف ہی مائل ہوتا کہ وہ ہمیشہ ان کے پاس رہیں، مگر امی جب بیمار ہوتی ہیں تو وہ امی کے پاس نہیں ٹھہر کر دوستوں کے ساتھ ٹہلنے نکل جاتے ہیں، جبکہ امی کا میلان بھی ابو کی طرف ہی ہوتا ہے، مزید ڈاکٹر کا مشورہ بھی ہوتا کہ امی کے پاس کوئی نہ کوئی ضرور رہے۔ بالکل ایسا ہی غضنفر نے کینچلی میں ایک فلم کے دو مناظر سے مرد وعورت کی ذہنیت کا اچھا موازنہ کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کے دگر ناول وش منتھن، مانجھی، شوراب وغیرہ میں بھی یہ کیفیت بار بار آتی ہے، جس سے ان کے ناولوں کے منظر میں شدت پیدا ہو جاتی ہے، بیان کا زور بڑھ جاتا ہے اور قاری کے تاثر میں اضافہ بھی۔ قاری کے احساسات وجذبات بھڑک اٹھتے ہیں، ان کے ذہن ودماغ میں بے شمار سوالات سر ابھارنے لگتے ہیں۔

خود میرا یہ حال ہے کہ طول طویل ناول دیکھ کر ہی خوف کھاتا ہوں، یہی وجہ تھی کہ غضنفر کے ناولوں سے پہلے کوئی ناول مکمل نہیں پڑھ سکا، غضنفر کے ناولوں میں جو سماجی ناہمواریاں پائی جاتی ہیں، وہ ہر ایک قاری کو اپنی طرف کھینچتی ہیں، انہیں دعوت فکر دیتی ہیں، ان کے ذہنوں کو گدگدا کر کچھ کرنے کا حوصلہ دیتی ہیں، بالخصوص خواتین کے لئے ایسے ایسے نمونے پیش کیے جاتے ہیں، اگر وہ خود چاہیں تو بے شمار مسائل سے خود کو محفوظ رکھ سکتی ہیں ،الغرض ان کے ناول معاشرہ کے عکاس ہیں، ان میں درد ہے، کسک ہے، ایسا درد جو معاشرہ کے ہر فرد کو اپنا محسوس ہو، ان کے کردار بھی معاشرہ کے جیتے جاگتے کردار ہوتے ہیں، گویا ان کے تمام ناول سماج سے مربوط ہیں، اچھی طرح خوب اچھی طرح۔

مصنف کی دیگر تصانیف: مشاہیر کی نظر میں

(1) قرآن کا نظریۂ سیاست

☆اس کتاب میں موصوف سلمہ نے سیاست سے متعلق بہت سے اہم سوالوں کو اٹھا کران پر مدلل بحث کی ہے۔ یقیناً یہ کتاب سیاست کے موضوع پر ایک معلوماتی کتاب ہے۔ زبان واسلوب بھی خوبصورت ہے۔ الحمدللہ صاحب کتاب بہترین صلاحیتوں کے حامل ہیں۔ دینی، معاشرتی، سیاسی اور دیگر موضوعات پر اخبارات میں ان کے مضامین کثرت سے شائع ہوتے ہیں، ان کے علم میں گہرائی وگیرائی کا ثبوت ان کی یہ کتاب ہے، مستقبل میں مصنف سے اچھی توقعات کی جاسکتی ہیں۔

مولانا اسرار الحق قاسمی (ایم پی)

☆ برادرم سلمان عبدالصمد نے قرآن کا 'نظریہ سیاست' میں جمہوریت پر سیر حاصل بحث کی ہے اوراس کی خوبی اور خامیوں کونشان زد کرتے ہوئے حکمت ومصلحت کے ساتھ سیاست کی آبیاری کے بیش بہا نظریات کوسامنے رکھا ہے اوراس سلسلے میں قرآنی بصیرت کے قیمتی جواہر پاروں سے اسے مدلل ومبرہن کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے نہایت اہم ہے اور اس میدان میں ایسی پیش کش ہے کہ اس پر مزید تحقیقات وتوضیحات کے لیے دوسرے اسکالرس بھی پیش رفت کریں گے۔

عبدالقادر شمس قاسمی

ہفت روزہ عالمی سہار، نئی دہلی

☆اس وقت حال تو یہ ہے کہ سیاست کے معنی تو لوگ صرف ایک ہی جانتے ہیں ، یعنی جہانبانی اور صرف اقتدار کی بھوک ۔ اگر نئی نسل اس سے باہر نکل کر اصولی سیاست کی طرف آ رہی ہے تو یہ ایک بڑا انقلاب ہے، سلمان عبدالصمد کے لئے دعا ہے اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

قطب اللہ ندوی، لکھنو

(2) دلکش ودلنشیں مکالمے

☆سلمان عبدالصمد نے جس عرق ریزی اور جانفشانی سے معاشرتی بگاڑ اور سماجی ناہمواریوں کو دلکش مکالمے کے ذریعہ اصلاح کا آئینہ دکھایا ہے، اس سے مستقبل میں بہت کچھ کر گزرنے کی بھرپور صلاحیت نظر آتی ہے۔

مولانا محمد جہانگیر عالم قاسمی، لکھنو

عزیز سلمان عبدالصمد نے غیر معمولی دلچسپی لیتے قرآن میں بیان کردہ دعوتی اصول ، حکمت، موعظہ حسنہ کو سامنے رکھ کر'دلکش ودلنشیں مکالمے' نامی کتاب ترتیب دی اور اس میں اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کر کے تعلیمی اداروں کے بچوں کو بہترین تحفہ دیا ہے۔

مولانا نذیر احمد قاسمی

دارالعلوم عثمانیہ، کاکوری، لکھنو

عزیزی سلمان عبدالصمد کو زمانہ طالب علمی بھی لکھنے لکھانے کا شوق ہے، لکھنو کے ایک سفر میں 'دلکش ودلنشیں مکالمے' کو دیکھنے کا موقع ملا، کتاب کی تیاری میں عرق ریزی اور جانفشانی معلوم ہوتی ہے، البتہ طالب علمانہ جھلک اور جوش وخروش سے پاک نہیں ہے۔

مفتی اسلم قاسمی

سابق استاد دارالعلوم دیوبند

غضنفر کے جن ناولوں، خاکے اور افسانے کے مجموعوں کو سلمان عبدالصمد نے اپنے مطالعے کا موضوع بنایا ہے، ان میں زیادہ تر کتابیں ادبی حلقے میں زیر بحث رہ چکی ہیں۔ تبصرے، تنقیدی تجزیے، استفساراتی مضامین گویا ہر کتاب معتبر لکھنے والوں کی تعبیر و تفہیم سے گزر چکی ہے۔ ایسے میں اس کتاب کا جواز صرف اتنا ہے کہ سلمان عبدالصمد نے اپنی تنقید کی اساس اور بجٹل متن پر رکھی ہے، علمی انحطاط کے اس دور میں جب کسی موضوع پر دو چار مضامین پڑھ کر الگ مضمون بنا لینے کا رویہ ناقدانہ شعار بن چکا ہو، اپنی گفتگو کا محور خالص متن کو قرار دینا جہاں مروجہ سہل پسندی کی شکست کا اعلان ہے، وہیں لکھنے والے کی بنیادی صلاحیتوں کو بھی اجاگر کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ انھوں نے مضامینِ نو کے انبار لگائے ہیں لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ دوسروں کے خرمنِ تنقید سے خوشہ چینی بھی نہیں کی ہے۔

ڈاکٹر واحد نظیر
جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی

GHAZANFAR KA FICTION

by

Salman Abdussamad

اردو افسانوی ادب کی تاریخ نے بہت نشیب و فراز دیکھے، انیسویں صدی کے آخر تک داستان مقبول رہی، ناول کی ابتدا ہوئی، بیسویں صدی کے ساتھ افسانہ آیا، کبھی ہیئتیں بدلیں، کبھی موضوعات بدلے، کبھی اسلوب میں تبدیلی آئی، کبھی کہانی سے کہانی ہی غائب ہوگئی، کبھی مبہم علامتوں کی شکل میں قصہ بیان کیا گیا اور کبھی کہانی پن اور بیانیہ کو ترجیح دی گئی، لیکن وہی افسانوی تخلیقات زندہ رہیں، جن میں قصہ پن موجود تھا اور جو قارئین کے دل و دماغ کو بہ آسانی چھو گئیں۔

غضنفر نے اس وقت لکھنا شروع کیا جب افسانہ ابہام و تجرید سے باہر نکل آیا تھا، کہانی نے قاری سے رشتہ جوڑ لیا تھا۔ اپنے معاصر فکشن نگاروں میں غضنفر اپنے اسلوب اور موضوع کے اعتبار سے منفرد نظر آتے ہیں۔ انھوں نے افسانوی ادب کی پوری روایت سے استفادہ کیا ہے۔ ان کے یہاں داستانوی طرز بیان بھی ہے، ترقی پسندانہ موضوعات بھی ہیں اور جدیدیت کا علامتی انداز بھی ہے۔ ''پانی'' سے لے کر ''مانجھی'' تک وہ مختلف رنگوں میں نظر آتے ہیں، ناولوں کا غضنفر افسانوں میں مختلف دکھائی دیتا ہے اور خاکوں میں بالکل ہی جدا۔ غضنفر کی زود نویسی پر بھی حیرت ہوتی ہے۔

نوجوان اسکالر سلمان عبدالصمد نے غضنفر کے ناولوں، افسانوں اور خاکوں کا انتہائی گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ بلاشبہ یہ قابل ستائش ہے۔ خوشی اس بات کی ہے کہ نوجوان ذہن اس طرف نہ صرف سنجیدگی سے متوجہ ہوا بلکہ تنقید کا حق بھی ادا کیا۔ ایم۔ اے کے طالب علم سے جو امید کی جا سکتی ہے، اس سے کہیں بڑھ کر سلمان نے غضنفر کے سبھی ناولوں کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے۔ ''حیرت فروش'' کی کہانیوں اور ''سرخ رو'' کے خاکوں پر بھی بحث کی ہے۔ یہ کتاب ان کی تنقیدی نظر کی گواہی دیتی ہے۔ فہرست کے عنوانات انتہائی دلچسپ ہیں۔ مثلاً ''شوراب کی ٹپکتی بوندیں''، ''مانجھی کا چپوار''، ''پانی کی خشکی''، ''سرخ رو کا سفید رنگ'' وغیرہ۔

مجھے امید ہے کہ سلمان عبدالصمد کی یہ تنقیدی کوشش ارباب اردو کو اپنی طرف متوجہ کرے گی۔ ان کی یہ ناقدانہ کاوش ان کے روشن مستقبل کی دلیل ہے۔ میں ان کی اس کتاب پر انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔

پروفیسر ابن کنول
صدر شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

EDUCATIONAL
PUBLISHING HOUSE
www.ephbooks.com

978-81-8223-379-0